غالب اور تصوف

[illegible]

شیخ غلام علی اینڈ سنز

غالب اور تصوف

سید محمد مصطفیٰ صابری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

GHALIB AUR TASAVVUF

By

Syed Mohammad Mustafa Sabiri

Price Rs. 60/-

1990

ISBN 81 - 85360 - 58 - 8

سنہ اشاعت ۱۹۹۰ء

تعداد ۵۰۰

قیمت ساٹھ روپے

مطبع فوٹو آفسیٹ پرنٹرس، بلیماران دہلی ۶

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۳۱۰۸ گلی عزیزالدین وکیل، کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone : 526162
774965

فہرست

تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس خاکدان میں اب تک اربوں انسان پیدا ہو چکے ہیں، خالق بعض افراد ایسے بھی پیدا کرتا ہے کہ جو دنیا میں اپنے ایسے کارنامے چھوڑ جاتے ہیں جو اوراق لیل ونہار پر نقش کالحجر ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے کجکلاہوں کو دنیا نے بھلا دیا، مگر افلاطون، ارسطو، غزالی، رومی، سعدی، خاقانی، خسرو، حافظ، عرفی، بیدل، اور غالب نے فلسفہ، حکمت و شعر و ادب کے جو انمول موتی دنیا میں چھوڑے ہیں، ان کو اہل علم آج قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب اُن ہستیوں میں سے ہیں جن کے اشعار کی قدر اُن کے زمانے میں نہیں ہوئی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے بالکل صحیح فرمایا ہے:۔

"لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا (غالب) جیسا جامع حیثیات آدمی خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اُٹھا۔"

(یادگارِ غالب)

غالب کے کلام میں فلسفہ، حکمت، تصوف، سوز و ساز، دل نشینی، دقتِ فکر، بلندی، فصاحت، بلاغت، گہرائی، گیرائی، ندرتِ بیان، آفریدگار کے وجود کی شدتِ احساس، خالق کی وہبی عنایتوں اور بیکراں بخششوں کے بیان کا سلیقہ، منعم کی فیاضی پر اعتماد، سب کچھ ملے گا۔ غالب کی شخصیت ہمہ گیر تھی، شاعروں کی محفل میں مسندِ صدارت پر نظر آتے ہیں، صوفیوں کی صحبت میں شاہد و مشہود کے راز بیان کرتے ہیں، مذہب کے حقائق اشعار میں پیش کرنے کا اُن کو بڑا ملکہ ہے، غالب قدیم شعراء کی روش پر نہیں چلے، اُن کو اپنی سخندانی پر فخر تھا، چنانچہ ایک مرتبہ بے ساختہ کہا ؎

برآورید گر ایں جا بود سخندانے غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

(اگر کوئی اس شہر میں سخن ور ہے تو اس کو میرے سامنے لاؤ کیونکہ مجھے بھی کچھ کہنا ہے)

غالب کو صرف اپنی شاعری پر ہی نہیں، علم پر بھی ناز تھا ؎

مانہ بودیم بریں مرتبہ راضی غالب شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

(یعنی میں شاعر بننے پر راضی نہ تھا بلکہ فنِ شاعری نے خود مجھ سے استدعا کی کہ مجھے اپنا فن بنا لیجئے)

کسی قدیم شاعر کے قدم پر اگر قدم پڑ گیا تو فرماتے تھے کہ میرے شعر میں توارد نہیں ہوا بلکہ اس قدیم شاعر نے ازل میں میری ہی متاع چرائی تھی ؎

مبر گمانِ توارد، بہ شعرِ من کہ دزد متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بُردست

کہا جاتا ہے کہ غالب زمانہ کی ناقدری سے تنگ آکر قنوطیت پسند (PESSIMIST) بن گئے تھے۔ بوئے گل سے اُن کا ناک میں دم آیا، سوزِ نہاں

سے دل جلا، آہ آتشیں سے بال عنقا کو آگ لگائی، بیداد کاوشہائے مژگاں سے کلیجہ چھلنی ہوا، داغ ہائے تمنائے نشاط برداشت کیے، ساری عمر قید حیات کو بند غم ہی سمجھتے رہے، ابنائے زمانہ نے آشنا ستایا کہ ان کو آسمان بھی جام واژگوں نظر آیا شراب میں خست اس لئے نہیں کی کہ ساقی کوثر کے باب میں ان کو سوئے ظن نہ تھا، یہاں تک کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کرتے ہوئے بھی بادۂ و ساغر کہے بغیر نہ بنی۔

اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ عمر خیام، حافظ اور غالب وغیرہ مئے معرفت سے سرشار ہیں مگر تینوں بادہ نوشی میں اس قدر مشہور ہوئے کہ عام لوگ ان کو صوفی نہیں بلکہ میخوار ہی سمجھتے ہیں، خیام اور ان کے ساقی کی تصویریں سارے عالمی ممالک میں ہر بڑی دکان پر نظر آئیں گی۔ ہم اس کتاب میں غالب کے دامن سے مئے نوشی کا دھبہ تو نہیں مٹا سکے مگر یہ ثابت کر سکے ہیں کہ وہ مئے معرفت سے اسی طرح سرشار تھے جس طرح عمر خیام اور حافظ تھے۔ مرزا غالب کو تصوف سے کس قدر حصہ ملا تھا وہ عنقریب ہمارے قارئین کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کے بعض اشعار کو صرف اس لئے مہمل قرار دیا کہ اُن میں تصوف کو "گوندھ" دیا گیا ہے۔ مثلاً ان کے اس شعر کو بعض شارحین نے مہمل قرار دیا، یا اس کا مطلب ایسا بیان کیا کہ جو "بطن شاعر" میں نہیں تھا۔ یہ اُن کے اُردو کے دیوان کا پہلا شعر ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مرزا غالب، بہادر شاہ ظفر کے اتباع میں دہلی کے ایک بزرگ کالے صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہو گئے تھے۔ ایک کامل شخص کے پاس بیٹھ کر کوئی محروم نہیں رہ سکتا۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"مرزا غالب کو مولانا فخر الدین دہلوی کے خاندان میں بیعت تھی۔"

مولانا حالی نے کئی جگہ ذکر کیا ہے کہ مرزا صاحب، حضرت میاں کالے صاحبؒ کے مکان میں رہے اور حضرت کے ذریعہ سے مرزا صاحب کی رسائی قلعہ معلّٰی تک ہوئی۔" مولانا حالی فرماتے ہیں "علم تصوف جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" اس سے مرزا غالب کو خاص نسبت تھی۔

مولانا حالی نے ایک جگہ غالب کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

"لیکن اس میں شک نہیں کہ میں مُوَحّد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مُؤَثِّرَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰہُ"

(یادگارِ غالب صفحہ ۴۸)

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "آبِ حیات" کے مسوّدہ میں مرزا غالب کے حالاتِ زندگی اپنے ہاتھ سے قلم بند کئے تھے۔ یہ مسوّدہ "صحیفہ" کے "غالب نمبر" میں آغا محمد باقر آزاد کے نوٹ اور حواشی کے ساتھ پاکستان میں شائع ہوا تھا۔ اس مسوّدہ میں مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہلِ ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے مگر تحصیل علوم درس کے طالب علمانہ طور پر نہیں کی۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ امیر زادے کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجۂ کمال تک پہونچائے۔ وہ کیسی طبع خداداد لایا ہوگا جس نے اس کے خیالات کو ایسا انداز، اور الفاظ کو یہ تراش اور ترکیب میں یہ روش پیدا کی۔ جا بجا ان کا قول ہے اور حقیقت میں لطف سے خالی نہیں کہ "زبانِ فارسی سے مجھے

مناسبت ازلی ہے "

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

" میری طبیعت کو اس زبان سے ایک قدرتی لگاؤ ہے "

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے :۔

" مرزا (غالب) اپنی حالت کو عوام سے چھپاتے تھے، جیسا کہ صوفیاء کا عام ضابطہ ہے "

مرزا غالب نے ایک خط اپنے زمانہ کے ایک بزرگ حضرت غمگین رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا ہے۔ اس کا اقتباس ۱۴۴ صفحہ پر ملاحظہ کریں۔

ہم نے اس کتاب میں غالب کے صوفیانہ اشعار کی جو تشریح کی ہے اس کو غالب کا اصل رنگ سمجھ کر پڑھنا چاہیئے۔ اسی لئے ہم نے یہ اقتباسات درج کئے ہیں تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ یہ اس شاعر کے اشعار کی تشریح ہے جو خود بھی بادۂ معرفت سے سرشار ہو چکا تھا۔

اب دوسرے پہلو پر غور کیجئے۔ غالب حضرت غمگینؒ کو، جو خود بڑے پایہ کے شاعر تھے، پیر و مرشد کہتے ہیں۔ حضرت غمگینؒ نے ایک مرتبہ اپنی رباعی مرزا کو بھیجی مرزا نے اس میں قافیہ کی غلطی بتلائی، اس پر حضرت غمگینؒ ان کو لکھتے ہیں :۔

" رباعی میں قافیے کی غلطی سہو کاتب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ میری بدحواسی اور پریشان خیالی اس کا سبب ہے۔ یہ ایسی غلطی ہے جو کوئی نادان بھی نہیں کرے گا حالانکہ بیس دفعہ میں نے اس رباعی کو پڑھا لیکن اس عیب کی طرف خیال ہی نہیں گیا، اگر آپ اس کی اصلاح نہ کرتے تو یہ رباعی دیوان میں اسی غلطی کے ساتھ درج ہو جاتی۔ اسی سبب سے میں نے

بارہا آپ کو لکھا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فن سخن وری میں یکتائے زمانہ کیا ہے لہذا آپ میرے دیوان کو اوّل سے آخر تک اصلاح کی نظر سے دیکھ لیں آپ تساہل سے کام لیتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں تو میری اس عرض کو ضرور قبول کرلیں۔ یہاں میرے ہم نشینوں میں کسی کو اتنی جرأت نہیں کہ میری اغلاط پر مجھے مطلع کریں...... آپ کو علم تصوف میں جو دستگاہ ہے، جس کا اظہار آپ کے خطوط سے ہوا وہ علمائے ظاہر کو بھی نہیں ہے۔ آئندہ سے مسائل تصوف کو ملاقات پر موقوف رکھیے، مجھے آپ کا آزاد رویہ بہت پسند ہے، اسی لئے میں آپ کی ملاقات کا خواہشمند ہوں، اگر ایسا شاہباز ہاتھ آجائے تو پھر سوائے عنقا کے شکار کے کسی طرف توجہ نہ کرے گا...... میں آپ کے طریقے سے بہت خوش ہوں، خدا تعالیٰ آپ کی بیرنگی میں ترقی دے، جب مجھ سے ملاقات ہوگی تو میں بھی اسی کی تائید کروں گا۔ یہ طریقہ میرا پسندیدہ ہے ؎

از دروں شو آشنا و از بروں بیگانہ وش   ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

("کوہستان" "غالب نمبر" ۱۶ فروری سنہ ۱۹۶۹ء)

غالب کی قابلیت اور اہلیت کے لئے یہی ثبوت کافی ہے کہ ایک ولی کامل جس کو وہ مرشد کہتے ہیں، نہ صرف ان کے مسلک کی تعریف کرے بلکہ ان سے اپنے دیوان کی اصلاح کے لئے استدعا کرے۔" سچ ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سوال کیا جاسکتا ہے کہ ہم نے تصوف کے مسائل بیان کرنے کے لئے غالب کا

سہارا کیوں لیا؟ اوّل تو تصوّف انتہائی حقیقت ہے اور ہم اس حقیقت کو غالب کے الفاظ میں جدت پسند اور فلسفیانہ دماغ والوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ آج کل ہر تعلیم یافتہ ہر چیز کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، غالب خود حقیقت شناس اور حقیقت بیں ہیں۔ ہم اگر صرف تصوّف پر کوئی کتاب لکھتے تو نئی روشنی کے نوجوان اس قدر اعتنا نہ کرتے۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ بیرونی ممالک میں غالب اور اقبال کے کلام کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب اور اقبال ہر جگہ مقبول ہیں اور ہر جگہ ان کے کلام کو الہام تصور کیا جاتا ہے۔

تصوّف اس قدر حقیقت ہے کہ امام غزالیؒ نے اس پر کئی کتابیں لکھی ہیں بلکہ ان کا قول یہ ہے کہ جو شخص تصوّف نہیں جانتا وہ نبوّت کی حقیقت کبھی نہیں جانتا "منقذ من الضلال" میں اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"وَبِالْجُمْلَةِ فَمَنْ لَمْ يُرْزَقْ مِنْهُ شَيْئًا بِالذَّوْقِ فَلَيْسَ يُدْرِكُ مِنْ حَقِيقَةِ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْاِسْمَ"

(یعنی مختصر یہ ہے کہ جس نے تصوّف کا کچھ مزا نہیں چکھا ہے وہ نبوت کی کچھ حقیقت نہیں جان سکتا بجز اس کے کہ نبوّت کا نام جان لے")

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

"صوفیوں کے طریقے کی مشق سے مجھ کو نبوّت کی حقیقت اور اس کا خاصہ بدیہی طور پر معلوم ہو گیا" (الغزالی صفحہ ۱۳۶)

امام غزالیؒ نے مزید فرمایا ہے:

"اس قدر ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ صفاتِ انسانی تمام آدمیوں میں

یکساں پیدا نہیں کی گئی ہیں، ذہن و ذکاوت، فہم و فراست، عقل و ذہانت، مختلف افراد صفات انسانی میں کس قدر مختلف المراتب ہیں ایک شخص ذہین ہے، دوسرا شخص اُس سے زیادہ ذہین ہے، تیسرا اُس سے بھی زیادہ ذہین ہے۔ بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہونچتی ہے کہ ایک شخص سے وہ افعال سرزد ہوتے ہیں جو بظاہر قدرتِ انسانی کی حد سے باہر نظر آتے ہیں، جو لوگ شاعری میں، قوت تقریر میں صناعی میں، ایجاد میں تمام زمانے سے ممتاز گزرے ہیں وہ اسی درجہ کی مثالیں ہیں۔ یہ درجہ فطری ہوتا ہے یعنی پڑھنے لکھنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ ابتدا ہی سے ان لوگوں میں یہ قوت مرکوز ہوتی ہے اور اسی وجہ سے دوسرے اشخاص گو کتنی ہی محنت و کوشش کریں ان کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔" (الغزالی صفحہ ۱۳۷)

ابھی آپ نے پڑھا ہے کہ مرزا غالب فطری طور پر ذہین تھے، رسمی طور پر کسی مدرسہ میں بھی نہیں پڑھا۔ کتاب کے شروع میں ہی آپ پڑھیں گے کہ صوفیا کے نزدیک ہر شخص کا ایک عین ہوتا ہے اس کو عین ثابتہ کہتے ہیں۔ ہر شخص کا عین خالق کے علم میں ازل سے ہوتا ہے۔ کوئی متنفس اپنے عین کے خلاف عمل نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی فطرتاً ذہین ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ازل سے ہی اُس پر حق کی عنایت ہے۔ غالب اس راز سے واقف تھے اِسی لئے انھوں نے فخر کیا ہے اور کسی کی ستائش اور مذمت کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

غالب کے صوفیانہ اشعار فی الحقیقت گنجینۂ معنیٰ کا طلسم ہیں۔ ان کے زمانے میں ان ہی اشعار کو دیکھ کر ان کو بے معنیٰ قرار دیا گیا۔ آخر تنگ آکر

ان کو کہنا پڑا سہ

از رد و ہم قبول تو فارغ نشستہ ایم — اے آنکہ خوبِ ما نہ شناسی ز زشتِ ما

(آپ کے رد اور قبول کی مجھے پرواہ نہیں کیونکہ آپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرا اچھا شعر کونسا ہے اور بُرا شعر کونسا ہے")

غالب کی یہ پیشنگوئی تو سو فیصدی صحیح ثابت ہوئی

ع : شہرتِ شعرم بہ گیتی، بعدِ من خواہد شدن

(دُنیا میں میرے اشعار کی شہرت میرے مرنے کے بعد ہوگی)۔

جیسا کہ ثابت ہو گیا ہے، غالب صوفی منش تھے، توحید وجودی کے نشہ سے سرشار تھے، اسی لئے اشعار دقیق ہونے کے باوجود اُن میں سوز اور اثر ہے، خالق کا شکر ادا کرنے کے بہت اشعار ملیں گے جن کی شعراء کے دیوانوں میں کمی نہیں۔ مگر غالب کے اس شعر کا جواب نہ ملے گا سہ

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

اللہ کے سامنے جان حاضر کر دینا بڑا کام ہے۔ خالق خود بھی اس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں، اس کی قدر کرتے ہیں اسی لئے اس کا درجہ بھی ان کی بارگاہ عالیہ میں بڑا ہے۔ مگر غالب کے نزدیک خالق کی بخشی ہوئی جان کو ان کے ہی سامنے پیش کر دینا کوئی بڑا کام نہیں۔ ان کی چیز تھی اُن کی امانت تھی اُن ہی کو واپس کی ہے لہٰذا کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ یہ تصور انھوں نے سعدیؒ سے لیا ہے سہ

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کُنی — منت شناس ازو کہ بخدمت گذاشتت

(یعنی تو احسان مت رکھ کہ بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے بلکہ اُس کا ہی احسان سمجھ کہ تجھ کو خدمت پر لگا رکھا ہے")

اس موقع پر یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہم قارئین کو غالب کے صوفیانہ خیالات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں شعر کی لطافت اور معنی آفرینی پر غالب کے متعلق متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، مجازی عشق کے متعلق بڑے نفیس اشعار اُن کے خزانے میں موجود ہیں مگر ایسے اشعار کو ہم نے ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ اس کتاب میں جو روش اختیار کی گئی ہے ایسا کرنا اُس کے خلاف تھا۔

غالب کے صوفیانہ اشعار کی تشریح میں صرف اُس شعر کے مطلب پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ اس کو لکھ کر تفصیل کر دی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے کی معلومات میں اضافہ ہو، مثلاً اس شعر کی تشریح میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اس شعر میں شریعت، طریقت، حقیقت، عقل و نقل سب کچھ ہے اسی لئے اس میں شرح و بسط سے کام لیا گیا ہے۔

غالب کے اس نعتیہ شعر کی تشریح میں ہم اختصار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اُس سے قارئین کو تسلی نہیں ہو سکتی تھی، ہر شخص محبوبؐ کا ذکر تفصیل سے سننا چاہتا ہے لہٰذا ہم نے رسول پاکؐ کی سوانح عمری ہی مختصر طور پر بیان کر دی ہے۔

شعر یہ ہے ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

تقدیر کا موضوع ایسا ہے جس کو ہر شخص تفصیل کے ساتھ جاننا چاہتا ہے، لہٰذا اس مسئلہ پر ہم نے معتدل بحث کی ہے تاکہ اس کا کوئی پہلو اوجھل نہ رہ جائے اور قاری کو اطمینان ہو جائے اور سارے شبہات دور ہو جائیں، نگاہ حقیقت تک پہونچ جائے۔

ظاہر و باطن کے زیرِ عنوان تنزّلاتِ ستہ پر مختصر بحث کی گئی ہے، یہ صوفیاء کا ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے، یہ عوام کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا مگر غالب کے اس شعر کی تشریح میں ؎

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　　پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

تنزّلاتِ ستہ کا ذکر کئے بغیر چارۂ کار نہ تھا مگر اس کی تفصیل دانستہ نہیں کی گئی کیونکہ اس سے قارئین کو خاص فائدہ نہیں پہونچ سکتا تھا مجمل ذکر کافی تھا سرسری نظر میں یہ مقامات قارئین کی سمجھ میں نہیں آسکتے تھے اس لئے ہم نے اس کے ساتھ نقشہ بھی دیدیا ہے۔ احدیّت، وحدیّت، واحدیّت، روح، مثال، جسم، انسان، ان کے مراتب نقشہ کو غور سے دیکھنے سے سمجھ میں آجائیں گے۔

ذاتِ محمدیؐ، حقیقتِ محمدیؐ، نورِ محمدیؐ کی وضاحت اس لئے الگ کی گئی ہے کہ اکثر لوگ ذاتِ محمدی، اور نورِ محمدی کو ایک ہی حقیقت سمجھتے ہیں، مگر ذاتِ محمدی اور حقیقتِ محمدی دو الگ الگ حقائق ہیں ان کو ایک ہی حقیقت سمجھنا الحاد ہے، کفر ہے، جہالت ہے۔

اس کتاب کے آخر میں حضرات صوفیاء کی مشہور اصطلاحات کی مختصر وضاحت کردی گئی ہے جس کی افادیت میں شبہ نہیں۔ ان اصطلاحات کو حافظ، جامی، عمر خیام اور دیگر صوفیاء نے اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔

اس کتاب کو تصنیف کرنے کا بڑا مقصد یہی تھا کہ لوگ تصوّف کی حقیقت کو سمجھیں، صرف نام جاننے سے کوئی فائدہ نہیں۔

ہم نے تصوّف کے نکات کی وضاحت کرتے ہوئے جن جلیل القدر کتابوں سے مدد لی ہے اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔ قرآن عظیم ▪ بخاری و مسلم،

فتوحات مکیہ، نصوص الحکم (شیخ محی الدین ابن العربیؒ یعنی شیخ اکبرؒ) مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ۔ حجۃ اللہ البالغہ، ہمعات (شاہ ولی اللہ)، تفسیر فتح العزیز (شاہ عبد العزیزؒ) احیاء العلوم الدین، کیمیائے سعادت (امام غزالیؒ)، مثنوی مولانا جلال الدین رومیؒ، سیرت النبی، الغزالیؒ (علامہ شبلیؒ)، صراط مستقیم (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ) ارشاد الطالبین (قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ) ریاض المرتاض (نواب صدیق حسن خانؒ) قرآن اور تصوف، رموز عشق (ڈاکٹر میر ولی الدینؒ)۔

تصوف کے مسائل کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب کی کوئی سطر بھی دین حق اور صوفیائے کرام کے مسلک کے خلاف نہ ہو اور جن مسائل کے متعلق عوام میں غلط فہمی پائی جاتی ہے اُن کی دل نشیں وضاحت کردی جائے مثلاً تقدیر، فنا، بقا، خیر و شر، ایمان و کفر، گناہ، نور محمدی وغیرہ۔ اس کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھنے کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ اطمینانِ قلب حاصل ہوگا، ذکر و فکر میں لطف آئے گا، شکوک و شبہات ختم ہوجائیں گے، شرح صدر ہوگا، حق الیقین کا احساس ہوگا۔

میں یہ بھی واضح کردوں کہ اس کتاب کی اشاعت میرے بس سے باہر تھی خصوصاً اس گرانی کے زمانے میں۔ مگر رب قدیر نے دستگیری کی، عزیز مصطفےٰ کمال نے مجھ کو ہمت دلائی، حوصلہ بڑھایا اور اس کتاب کے چھپوانے میں بہت دوڑ دھوپ کی۔ ہمارے دوست مولوی ظہیر احمد نے جو خود بھی علم دوست ہیں اس کی کتابت بہت ذوق و شوق سے کی، خداوند کریم ہماری کوششوں کو مشکور فرمائے اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔ میں آخر میں

اپنے استاذ فاضل اجل، عالم با عمل حضرت مولانا نور الحسن صابری رح
رام پوری خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح کے لئے حق سبحانہٗ
سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کو جنت میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے کہ جن کی
شاگردی، کرامت اور فیضانِ نظر سے میں یہ کتاب لکھنے کے قابل ہوا ؎

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بہ ما کنند

سید محمد مصطفےٰ صابری
قصبہ رامپور ضلع سہارنپور یوپی

غالب اور تصوّف

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

بے شبہ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ صوفی اپنے آپ کو دریائے وحدت کا ایک قطرہ سمجھتا ہے۔ اس حالت کو "سکر" کہتے ہیں۔ یہ اولیاء کا مرتبہ ہے، یہ "مقام فنا" کہلاتا ہے۔ اس کے بعد "بقا" کا مرتبہ ہے، یہ مقام انبیاء کا ہے، بعض مقربین کو بھی یہ مقام عطا ہوتا ہے۔ اس کتاب میں آپ کو ان مقامات پر سیر حاصل بحث ملے گی۔

یہ مسلّم ہے کہ انسان کو جو دشواریاں پیش آتی ہیں، جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں وہ اس کو قنوطیت پسند اور گوشہ نشین بنا دیتے ہیں۔ چونکہ مصیبت میں اکثر خدا یاد آتا ہے اس لئے عام دانشوروں نے اس سے یہ نتیجہ استنباط کر لیا کہ افلاس، آلام، مایوسیاں، محبوب اقرباء کی جدائی ہی انسان کو تصوف کی پناہ میں لاتی ہیں۔

غالب کا یہ کمال یہ ہے کہ انھوں نے جو بھی ایسا شعر کہا ہے اس کی "تائید قرآن و رنہ حدیث سے ہوتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

۵ دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس شعر کا صحیح مطلب اسی وقت بیان کیا جا سکتا ہے جبکہ کسی کے سامنے یہ حدیث قدسی ہو۔ بلکہ غالب جس حد تک وسیع النظر تھے اس سے ہم کو یہ یقین ہے کہ انھوں نے اسی حدیث کا خوبصورت اور دل نشیں ترجمہ کر دیا ہے۔ حدیث یہ ہے :-

كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ :-

(میں ایک مخفی خزانہ تھا مجھے اس بات سے محبت ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں لہذا میں نے مخلوق پیدا کر دی) ۱

مستشرقین خصوصاً براؤن، نکلسن، اور ہندوستان و پاکستان کے بعض محققین کا خیال ہے کہ اسلامی تصوف یا تو ایرانیوں سے لیا گیا ہے یا یونانیوں سے بعض نے کہا ہے کہ ہندوازم سے لیا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اس وقت عرب ایک اَن پڑھ قوم تھے وہ اس قدر باریک باتیں سمجھ ہی نہیں سکتے تھے اس وقت قرآن نے کہا "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ہم (اللہ) انسان سے اس کی رگ گلو سے بھی قریب تر ہیں) بقول خسرو ع

دُور از جانی و در جانی ہنوز

ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ تصوف کی نکات کی تشریح کے لئے غالب ہی کو کیوں منتخب کیا گیا، جو خود باعمل نہ تھے، اس موقع پر اس کتاب میں گناہ کے موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو غور سے دیکھنا چاہیئے، بہر حال اس موقع پر اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نبی کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کم گنہگار ہے۔ پھر ایک مسلمہ اصول ہے خُذْ مَا صَفَا دَ

دَعْ مَاکَدَرْ (جو چیز اچھی ہو اس کو لے لو باقی ناقص کو چھوڑ دو) ہم نے غالب کے صرف ان اشعار کی تشریح کی ہے جن میں تصوف پایا جاتا ہے۔ غالب کے سارے اشعار صوفیانہ نہیں، ایسا دعویٰ تو مولانا رومیؒ کی مثنوی کے متعلق بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں اکثر حکایتیں ہی ہیں۔ وحدت الوجود کے مسئلہ کے سوا اس مثنوی سے دیگر مسائل تصوف کا اخذ کرنا تو انتہائی مشکل ہے۔ غالب کے اشعار میں ذرا غور کرنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شعر سے تصوف کا کونسا مسئلہ نکلتا ہے یا فلسفہ کے کس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بعض حکمائے یونان کا خیال ہے کہ عالم حادث (فنا پذیر) ہے غالب بھی اس سے متاثر ہیں مگر دیکھئے کس خوبصورتی کے ساتھ ثابت کرتے ہیں ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہگذار باد یاں

یعنی ساری کائنات فنا پذیر ہے، یہاں تک کہ سورج بھی اس چراغ کی مانند ہے کہ جس کو اس راستہ پر رکھ دیا جائے جہاں سے ہوا گزرتی ہو اور اس کو ایک ہی جھونکے سے بجھا دے۔

دنیا میں لوگ خوب دل لگا کر رہتے ہیں مگر اس کی بساط کچھ نہیں، محض خیال ہے اس کو کس بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

؎ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
؎ ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

تصوف کے مختلف مسائل پر غالب کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔ تخلیق و ابداع ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اخلاق سے

بلکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

خیر و شر سے

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

تقدیر سے

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

خلوص سے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

ظاہر و باطن سے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

عالم مثال سے

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

تنزیہہ و تشبیہہ سے

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

قُرب و معیت سے

برآورد بے کلفت و سمت و سُو　　بہ نور السمٰوٰت والارض رُو

عقل و مذہب سے

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　کھیل لڑکوں کا ہُوا، دیدۂ بینا نہ ہُوا

استعداد از تکلیف سے

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طُور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہم نے اس کتاب میں ان میں سے اکثر اشعار کی مکمل تشریح کی ہے، تشریح کے دوران غیر ارادی طور پر تصوف کے ایسے نکات کی توضیح بھی ہو گئی ہے جو عوام کی نظر سے اوجھل تھے یا اگر تصوف کی بعض کتابوں میں ملتے ہیں تو اس قدر تشنہ رہ گئے ہیں یا اتنی مُغلق زبان میں ہیں کہ جن کو خواص ہی سمجھ سکتے ہیں عوام کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ ہم نے تفصیل کے ساتھ ان کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ارسطو نے جب فلسفہ کی تشریح کی تو اُس کا اُستاد افلاطون ناراض ہوا اور کہا کہ تم نے فلسفہ جیسی بلند چیز کو عوام کے ہاتھوں میں دیدیا۔ ارسطو نے جواب دیا کہ اگرچہ میں نے فلسفہ کے مشکل مسائل کی تشریح کی ہے مگر اس قدر مشکل زبان میں کی ہے کہ خواص ہی سمجھ سکتے ہیں، عوام کچھ نہیں سمجھیں گے۔

شیخ محی الدین ابن العربیؒ (شیخ اکبرؒ) پہلے عالِم اور صوفی ہیں جنھوں نے وحدت الوجود (ہمہ اوست) پر فن کی حیثیت سے کتابیں لکھی ہیں جن میں "فصوص الحکم" اور "فتوحاتِ مکیہ" بہت مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے دیباچہ میں انھوں نے صاف لکھا ہے کہ جو اس فن کو نہیں جانتا وہ میری اِن کتابوں کو نہ پڑھے۔ علماء میں یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ بعض متاخرین کا علم، متقدمین سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی نظروں سے بہت سی کتابیں گزر چکی ہوتی ہیں جو متقدمین کے بعد لکھی گئی ہیں۔ غالب شعراء میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ تصوف کے سارے مسائل پر اُن کی گہری نظر ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اس لئے اُن کے قلم سے بے ارادہ ایسے اشعار نکل گئے ہیں جن میں خود ستائی اور تعلّی کا پہلو نکلتا ہے۔ مثلاً

غالب قلمت پردہ کشائے دمِ عیسیٰ ست — چوں بر روشِ طرزِ خدا داد بہ جُنبد
فیضِ حق است قبولِ سخن و شادیِ فتح — بہ قلم نازم اگر تکیہ موسیٰ بہ عصا ست

عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا مجھے راہِ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب

مرزا غالب اپنے صوفیانہ عقائد کے علاوہ عملاً بھی صوفی تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:۔

"مرزا غالب کو مولانا فخر الدین دہلویؒ کے خاندان میں بیعت تھی۔"

مولانا حالیؒ نے "یادگار غالب" میں کئی جگہ یہ ذکر کیا ہے کہ:۔

"مرزا صاحب، حضرت میاں کالے صاحبؒ کے مکان میں رہے اور حضرتؒ کے ذریعہ سے مرزا صاحب کی رسائی قلعہ معلّٰی تک ہوئی۔"

مولانا حالیؒ "یادگار غالب" میں لکھتے ہیں:۔

"علم تصوّف، جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" اس سے مرزا غالب کو خاص مناسبت تھی، حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گذرے تھے اور سچ پوچھئے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ بارھویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔"

(یادگار غالب صفحہ ۵۴)

"انھوں نے تمام عبادات و فرائض اور واجبات سے صرف دو چیزیں لی تھیں، ایک توحید وجودی اور دوسری نبیؐ اور اہل بیت نبیؐ کی محبت۔"

(یادگار غالب صفحہ ۶۷)

ایک جگہ غالب کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:۔

"لیکن اس میں شک نہیں کہ میں مؤحّد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں:۔

"لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، لا مَوجُودَ اِلَّا اللّٰہُ
لا مُؤثِّرَ فِی الوُجُودِ اِلَّا اللّٰہُ"

(یادگار غالب صفحہ ۴۸-۴۹)

مرزا غالب نے ایک خط اپنے زمانے کے ایک بزرگ حضرت غمگین رحمۃ اللہ علیہ
یہ خط طویل ہے ہم اس کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ اس سے مرزا صاحب کا
رجحان طبع صاف معلوم ہوتا ہے۔ کچھ انکسار کے بعد لکھتے ہیں:۔

"میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے بےرنگی کی طرف مائل کر دیا اور تھوڑی
سی بیخودی عنایت کر دی ہے، وجود کی تقسیم پر جیسا کہ اہل نظر کا اعتقاد
ہے میں یقین نہیں رکھتا، کیونکہ وجود ایک ہے اور ہرگز تقسیم قبول نہیں
کر سکتا، نہ اس میں تغیر و تبدل واقع ہو سکتا ہے اور وجود کے
مقابلے میں عدم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، وجود اور ہستی کے سوا
جو کچھ ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے اور حق کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل ہے ؎

ما ہماں، عین خودیم، امّا خود از وہم دوئی
در میان ما و غالب، ما و غالب حائل است

ہر قسم کے ذکر و فکر اور ذوق میں سے میرے دل کو محی الدین ابن العربیؒ کے
ایک فقرے نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے کہ "اَلْحَقُّ مَحْسُوْسٌ وَالْخَلْقُ
مَعْقُوْلٌ" یعنی خلق کا وجود ہماری عقل و فہم کے سوا کہیں نہیں ہے اور جو
کچھ بھی محسوس ہوتا ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں، میرا ایمان یہی ہے، باقی سب
وہم ہے۔ اور اس عالم میں جو کچھ ہے از قسم ولایت و نبوت، حشر و نشر، عذاب
و ثواب سب درست ہے اور ان سب پر میرا ایمان ہے۔ آپ کی توجہ باطنی

ہے مجھے بے ارادہ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کا قول مبارک یاد آگیا۔ "اعیان ثابتہ نے وجود کی بُو بھی نہیں سونگھی" (اس موقع پر مرزا غالب نے یہ شعر لکھے ہیں) ؎

چوں پردہ شب یار مصور بہ خیال است | ایں کار گردِ ہم ز پیدائی اشیاء
اندیشہ دو صد گل کدہ، گل بردہ بہ دامن | امّا ہمہ از نقش و نگار پر عنقا

مرشد کے حضور میں ان حالات کا عرض کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک گھڑا پانی دریا کیلئے لائے یا ایک پھول کی پنکھڑی باغ کی نذر کرے۔ لیکن مقصد صرف اپنے عقیدہ کا اظہار ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ یہ عقیدہ رکھنے والا کسی چیز کا منکر نہیں ہے سب کو ایک کیفیت کے ساتھ قبول کرتا ہے، کفر کو بھی اور اسلام کو بھی، عین کو بھی اور غیر کو بھی۔ یہ سب تصور کی حیثیت سے موجود ہیں، لیکن وہ تصور نہیں جو ہم کرتے ہیں بلکہ وہ تصور جو اس کیفیت خاص کو حاصل ہے، خدا کے لئے مجھ پر ایسی توجہ فرمائیں کہ میرا یہ شغل ترقی کر جائے تاکہ رفتہ رفتہ میں بالکل مستہلک اور مستغرق ہوجاؤں اور رنگ اور بے رنگی دونوں سے چھوٹ کر عدم محض ہوجاؤں۔"

یہ سب مرزا غالب کے الفاظ ہیں۔ اہل نظر مذکورہ سطور کو پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں کہ غالب کیا تھے، غالب بے شک صوفی تھے، غالب کو عام لوگ جو کچھ سمجھتے ہیں وہ ایسے نہیں تھے بلکہ اُس سے بلند و بالا تھے۔ ہم نے ان کے صوفیانہ اشعار کی جو تشریح کی ہے اس کو غالب کا اصل رنگ سمجھ کر پڑھنا چاہیئے۔ اسی لئے ہم نے یہ اقتباسات درج کئے ہیں تاکہ قارئین کو معلوم ہوجائے کہ یہ اس شاعر کے اشعار کی تشریح ہے جو خود بھی بادۂ معرفت سے سرشار ہوچکا تھا۔ — مصنّف

اِیمَانْ

اب ہم حدیث جبرئیلؑ کی تشریح کرتے ہیں جس میں ایمان، اسلام، تصوّف سب کچھ ہے، اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تصوّف بھی اسلام کا ہی ایک جزو ہے۔"

حدیث جبرئیلؑ: تحفۃ الاخیار، ترجمہ مشارق الانوار کی فہرست میں یہ الفاظ ہیں

"حدیث جبرئیل دراں حقیقت اسلام وایمان واحسان کہ عبارت از تصوّف ودرویشی ست مذکور ست۔"

اب ہم اس کا ترجمہ من وعن و تشریح درج کرتے ہیں۔

"بخاری و مسلم میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تو اس کی گواہی دے کہ سوائے خدا کے کوئی بندگی کے لائق نہیں اور محمدؐ خدا کے رسول ہیں اور یہ کہ تو نماز پڑھے، زکوٰۃ دیوے اور رمضان کے روزے رکھے اور خانۂ خدا کا حج کرے اگر تجھ کو اس راہ کی طاقت ہو یعنی بشرط خرچ اور سواری کے۔" یہ حضرتؐ نے جبرئیلؑ سے کہا جبکہ جبرئیلؑ حضرتؐ کے پاس مرد کی صورت پر آئے تھے سو انھوں نے (جبرئیلؑ) کہا "آپ نے سچ کہا۔" جبرئیلؑ نے کہا "مجھ کو ایمان کی حقیقت بتلایئے۔ حضرتؐ نے فرمایا" ایمان یہ ہے کہ تو دل سے مانے اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو،

اور اس کے پیغمبروں کو اور پچھلے دن کو یعنی قیامت کو اور تقدیر کو مانے بھلی یا بُری، جبرئیلؑ نے کہا "آپؐ نے سچ کہا"۔ جبرئیلؑ نے کہا، تو احسان (تصوف) اور اخلاص کی حقیقت بتلایئے۔ حضرتؐ نے فرمایا "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ ؕ "یعنی تو اللہ کی ایسی عبادت کرے کہ جیسے کہ اُس کو دیکھ رہا ہے، سو اگر اس طرح کا دیکھنا تجھ سے نہ ہو سکے تو یوں جان کہ وہی تجھ کو دیکھتا ہے۔ جبرئیلؑ نے کہا تو اب قیامت کا حال فرمایئے کہ کب ہوگی؟ حضرتؐ نے فرمایا "جواب دینے والا پوچھنے والے سے کچھ زیادہ تر نہیں جانتا یعنی قیامت کی ناواقفی میں تم اور میں دونوں برابر ہیں"۔ جبرئیلؑ نے کہا "تو اس کے پتے ہی بتلایئے۔ حضرتؐ نے فرمایا قیامت کی نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنے مالک اور مربّی کو جنے، یعنی مالکوں کے نطفے سے لونڈیاں جنیں تو ان کی اولاد بھی اپنے باپ کی طرح لونڈیوں کی مُربّی ٹھہری۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے قریب کنیزک زادوں کی کثرت ہوگی، اور دوسری نشانی قیامت کی یہ ہے کہ تو دیکھے ننگے پاؤں، ننگے بدن، محتاج بکریاں چرانے والوں کو کہ بڑا بیال ماریں گے عمارت میں، یعنی کمینے اور بے حقیقت لوگ دولت مند ہوں گے بڑی بڑی عمارتیں بنا کر فخر کریں گے"۔

پوری روایت اس حدیث کی یوں ہے کہ عمر فاروقؓ نے کہا کہ ہم حضرتؐ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک مرد نمودار ہوا نہایت سفید کپڑے اور بہت سیاہ بال والا کہ اس پر کچھ سفر کا اثر نہ معلوم ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہ تھا، سو چلا آیا یہاں تک کہ حضرت کے پاس بیٹھا زانو کو حضرتؐ کے زانو کے ساتھ ملا کر، اپنی دونوں ہتھیلیاں حضرتؐ کے زانو پر رکھیں اور کہا کہ اے

محمد مجھ کو اسلام کی حقیقت بتلایئے ، تب حضرتؐ نے یہ حدیث فرمائی۔ عمر فاروقؓ نے کہا کہ پھر وہ مرد چلا گیا اور میں دیر تک حیرت میں چپکا رہا۔ پھر حضرتؐ نے فرمایا " اے عمرؓ تو جانتا ہے وہ کون تھا ؟ " میں نے کہا " خدا اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتا ہے ، حضرتؐ نے فرمایا کہ یہ جبرئیلؑ تھا تمہارے پاس تم کو دین سکھلانے کو آیا تھا "

اس حدیث کو حدیث جبرئیلؑ کہتے ہیں ، اس واسطے کہ سائل حضرت جبرئیلؑ تھے۔ اور اُمّ الاحادیث اور اُمّ الجوامع بھی اس کا نام ہے یعنی سب حدیثوں کی جڑ ہے ، اس واسطے کہ جو مطلب اور احادیث میں ہیں وہ سب اس حدیث میں موجود ہیں۔ جیسے سورۂ فاتحہ کو اُمّ الکتاب کہتے ہیں کہ قرآن کے سب مطلب پر شامل ہے۔

حضرت جبرئیلؑ نے چار چیزیں حضرتؐ سے پوچھیں۔ اوّل اسلام کی حقیقت دوسرے ایمان ، تیسرے احسان ، چوتھے قیامت "

اسلام کی حقیقت پانچ ارکان ہیں۔ توحید ، رسالت کی گواہی ، نماز ، زکوٰۃ ، رمضان کے روزے اور حج "

معلوم ہوا کہ اسلام ظاہری عمل کا نام ہے اور ایمان تصدیق قلبی اور اعتقاد دلی کا " ـــــــ پھر حضرتؐ نے احسان (اخلاص یا تصوّف) کے دو درجے فرمائے۔ اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ عبادت میں ایسا حضور ہو کہ گویا خدا کو دیکھتا ہے ، اس کو مشاہدہ کہتے ہیں۔ اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ یہ تصور کرے کہ خدا مجھ کو دیکھتا ہے اس کو مراقبہ کہتے ہیں۔ اس تصور میں بھی کمال تعظیم اور نہایت ادب اور حیا اور شوق اور حضوری حاصل ہو گی ، ممکن نہیں کہ اس تصور میں آدمی ادب

چھوڑ دے یا اِدھر اُدھر التفات کرے، جیسے بادشاہ اگر کسی کو دیکھتا ہو تو کیا ممکن ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں ہلا دے یا نظر کو اٹھا دے۔ معلوم ہوا کہ تصوف اور درویشی احسان کا نام ہے۔ ظاہری اعمال کو اسلام کہتے ہیں اور باطنی اعتقاد کو ایمان کہتے ہیں۔ حضوری، اخلاص (تصوّف) کو احسان کہتے ہیں۔ دین اور شریعت، اسلام ایمان اور احسان) کے مجموعے کا نام ہے۔ اور گاہے اسلام اور ایمان کو ایک کہتے ہیں اس واسطے کہ اسلام بدون ایمان کے درست نہیں اور ایمان بدون اسلام کے کامل نہیں۔ اور بعضے لوگ احکام ظاہری کو شریعت کہتے ہیں اور تصفیہ باطن کو طریقت اور مشاہدے و مراقبے کو حقیقت کہتے ہیں۔ معلوم کیا چاہیئے کہ دین کی بنیاد فقہ، کلام اور تصوّف پر ہے، سو اس حدیث میں حضرت نے تینوں مقام کو بیان فرمایا ہے۔ اسلام اشارہ ہے فقہ کا جس میں اعتقاد کا بیان ہے اور احسان اشارہ ہے تصوّف کا، جس میں حق الیقین اور مشاہدہ اور مراقبہ مذکور ہے۔ معلوم ہوا کہ دین میں کامل وہی ہے جو فقہ اور کلام اور تصوّف کا جامع ہو اور ان تینوں میں سے بعض ہو اور بعض نہ ہو وہ ناقص اور کچا ہے۔"

(تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰)

تخلیق!

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ غالب کے اُردو دیوان کا پہلا شعر ہے۔ بعض شارحین نے اس کو بے معنی قرار دیا ہے۔ اور اس پر تو سب ہی کا اتفاق ہے کہ یہ مشکل ترین شعر ہے۔ بعض نے یہ اعتراض کیا ہے کہ پیکرِ تصویر کے کاغذی پیرہن ہونے کے کوئی معنی نہیں، اور کہیں بھی یہ رسم نہیں تھی کہ مستغیث کاغذ کا پیرہن پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہو، مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ بعض جگہ ایسی رسم تھی۔ اس کا ثبوت کمال اسمٰعیل کا یہ شعر ہے ؎

کاغذی جامہ بپوشیدہ بہ درگاہ آمد
زادۂ خاطرِ من تا بدہی دادِ مرا

اب ہم اس شعر کا مطلب بیان کرتے ہیں۔ در اصل غالب نے سعدی کے اس شعر کو اپنے ذوقِ مشکل پسندی کے سبب اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ذوقؔ نے اس تصور کو یوں پیش کیا ہے ؎

عالم تمام چشم حقیقت نگر بنا
منہ دیکھتا ہے آئینہ، آئینہ ساز کا

غالبؔ کا یہ شعر "گنجینۂ معنی کا طلسم" ہے۔ انھوں نے خالق اور مخلوق کے تعلق کو گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بالفاظ دیگر تصوف کے دریا کو ایک کوزہ میں بند کیا ہے۔ اس شعر کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ ساری کائنات گویا ایک نقش ہے جو نقّاش (خالق) کی صنّاعی کا ثبوت زبانِ حال سے دے رہا ہے۔ نقش کیا ہے؟ اشیاء کی صورتیں ہیں! اشیاء کو اپنی صورتیں بنانے پر قبل تخلیق کوئی اختیار نہ تھا۔ تخلیق کیا ہے؟ قادر مطلق کی قدرت کا ظہور یا تمثّل یا تجلّی۔ یہ وضاحت شیخ محی الدین ابن عربی نے کی ہے جن کا ذکر "تعارف" میں آچکا ہے۔ اور مرزا غالب وحدۃ الوجود میں ان ہی سے متاثر ہیں۔ شیخ محی الدینؒ کی تصانیف پر مرزا کی گہری نظر ہے اُسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہم آئندہ جو غالب کے صوفیانہ اشعار کی تشریح کریں گے وہ اُسی رنگ میں ہو گی۔ اس رنگ کے علاوہ غالب کے اشعار کی تشریح صحیح نہیں ہو گی۔

یہ ساری کائنات ایک نقش ہے جو قبلِ تخلیق نقّاش (حق عزّ اسمہٗ) کے علم میں تھا۔ جس کو ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں ذہن میں تھا۔ کاتب جب کوئی لفظ لکھتا ہے، مصوّر جب کوئی تصویر بناتا ہے تو پہلے اس کی خیالی تصویر اپنے ذہن میں قائم کر لیتا ہے۔ امام غزالیؒ نے کائنات کو اسی لئے مکمل اور عجیب کہا ہے کہ یہ خالق کے علم کا ظہور ہے اس دنیا میں کوئی نقص نہیں، کیونکہ صانع مطلق میں کوئی بخل نہیں، قدرت میں کوئی کمی نہیں، کامل کی جو بھی چیز ہو گی وہ کامل ہی ہو گی۔ غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ساری کائنات کسی نقاش کا نقش ہے جو نقاش کی صنّاعی کا گواہ ہے۔ اس جگہ افلاطون (سنہ ۲۰۴ء

سے ۲۶۹ء تک) نے بڑی ٹھوکر کھائی، چونکہ نبوت کا فیض نہیں پہونچا اسی لئے صاف کہہ دیا کہ نقاش اور نقش ایک ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ساری کائنات خدا کا اشراق ہے جیسے آفتاب کی شعاع، مگر شعاع آفتاب سے جدا نہیں۔ یہی فلسفہ اشراقیت ہے۔ اسی لئے جیمس براؤن اور نکلسن کو دھوکا ہوا ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ مسلمان صوفیاء نے "ہمہ اوست" کا تصور افلاطون اور ایرانی حکماء سے لیا ہے۔ اب دیکھئے اسلام کا مشہور صوفی (شیخ محی الدین ابن العربی) کیا کہتا ہے، اور قرآن وحدیث کا دامن پکڑتے ہوئے کس طرح اس "پل صراط" سے گذر گیا ہے۔ شیخ الاکبرؒ فرماتے ہیں "کائنات کا نقش ازل سے خالق کے علم میں تھا۔ چونکہ خالق کا علم ازلی ہے لہذا نقش کا وجود علمی بھی ازلی ہوا۔ صوفیائے کرام اور محققین اسلام کے نزدیک انسان بھی عدم مطلق نہیں۔ عدم اضافی تھا/ انسان یا کوئی شئے یا کائنات پیدا ہونے یا ظہور میں آنے سے پہلے عدم مطلق نہیں ہوتی، عدم اضافی ہوتی ہے۔ عدم مطلق اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شئے نہ خارج میں موجود ہو نہ خالق کے علم میں ہو۔ عدم اضافی اسے کہتے ہیں کہ کوئی شئے خارج میں موجود نہ ہو مگر خالق کے علم میں ہو، شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ عدم مطلق کوئی چیز نہیں ہے وہ پایا ہی نہیں جاتا۔ عدم اضافی اللہ کے علم میں پایا جاتا ہے خواہ خارج میں نہ پایا جائے۔ شیخ محی الدین ابن العربیؒ نے یہ نکتہ اپنے دماغ سے پیدا نہیں کیا بلکہ اپنی خداداد ذہانت سے قرآن سے پیدا کیا ہے۔ اللہ عز اسمہٗ فرماتے ہیں:

اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○	جب اللہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ "ہوجا" پس وہ چیز ہوجاتی ہے۔

دیکھئے الفاظ کس قدر سادہ وصاف ہیں، عرب کا ایک بدو بھی آسانی سے

سمجھ لیتا ہے اور دنیا کا بڑے سے بڑا فلاسفر بھی غور و فکر کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے۔
شیخ اکبرؒ سوال کرتے ہیں کہ جب کوئی شئے موجود ہی نہیں تو خالق کس کو کہتا ہے کہ "ہوجا"؟۔ اس کا جواب انھوں نے خود دیا ہے کہ شئے خارج میں موجود ہونے سے پہلے عدم اضافی کے مرتبہ میں رہتی ہے۔ یعنی اللہ کے علم میں ہوتی ہے۔ اسی کو شیخ "عین ثابتہ" کہتے ہیں۔ خالق اسی کو فرماتے ہیں "ہوجا" یعنی پردۂ علم سے نکل کر خارج میں (یا عالم شہود میں یا دنیا میں) آ۔ تو حکم کے مطابق وہ چیز ہوجاتی ہے۔ یعنی عالمِ خارجی میں موجود ہوجاتی ہے، یہی تخلیق ہے۔ اسی کو عرفِ عام میں کہتے ہیں "خدا نے پیدا کیا" اسی لئے قرآن کہتا ہے اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ ۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ!
شیخ کا موقف یہ ہے کہ کائنات اور کائنات کی ہر چیز ایک نقش ہے جو ذاتِ حق کی صورتِ علمی ہے، یہ نقش قائم بالذات نہیں بلکہ نقاش کے ذہن کا محتاج ہے۔ اللہ کی ذات پاک اس کی مُقوّم ہے۔ نقش محدود و متعیّن ہے، صورت رکھتا ہے لیکن نقاش کے ذہن یا علم کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ اِن تعیّنات سے آزاد ہے، نقّاش عالِم ہے اور نقش معلوم۔ شیخ کے نزدیک خالق اور مخلوق میں جو نسبت ہے وہ بڑھئی اور تخت کی سی نہیں ہے جیسا کہ ظاہر پرستوں کا خیال ہے کہ بڑھئی نے ایک تخت بنا دیا اب بڑھئی کا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کے ساتھ ہی افلاطون کے نظریئے کے برخلاف نقّاش نقش نہیں اور نہ ہی نقش نقاش ہے۔ بالفاظِ دیگر دونوں میں عینیت نہیں بلکہ دونوں میں کلّی غیریت ہے!
غالب نے یہاں یہ کمال کیا ہے کہ وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے کے باوجود سارے شعر کو وحدت شہود کے رنگ میں پیش کیا ہے اور خالق و مخلوق کی غیریت کو خوب اُجاگر کیا ہے۔ ع "نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا"۔ "کس کی" لفظ کی داد نہیں دی جا سکتی۔ گویا غالب نے یہ ثابت کر دیا کہ خالق و مخلوق میں گہری نسبت ہونے کے باوجود

غیریت کُلّی ہے۔ یالفاظِ دیگر "شئے" خدا نہیں ہو سکتی۔ "شئے" کے معنی یہ ہیں کہ جو خالق نے چاہا تھا۔ اُس کا خارجی وجود، لہٰذا "شئے" کسی حالت میں خدا نہیں۔ اس کا یہ شرف کچھ کم نہیں کہ واجب الوجود کے علم سے عالم شہود میں آئی ہے۔ اگر کسی صوفی نے "شئے" کو یا خود اپنے آپ کو (کیونکہ وہ خود بھی شئے ہے) خدا کہہ دیا تو وہ حالت سے مغلوب ہو گیا ہے اور حقیقت مستور ہو گئی ہے۔ اشیاء کی ذوات قبل تخلیق علم الٰہی میں ثابت ہیں۔ شیخ اکبرؒ ان ہی ذوات کو اعیانِ ثابتہ، ماہیاتِ اشیاء، حقائق اشیاء اور صورِ علمیہ کہتے ہیں۔ یہی حقائق خارج میں آنے کے بعد غالب کے "نقش فریادی" بنتے ہیں۔

23/12/85

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہ

ذاتِ خلق

معبودیت — عبادت

ربوبیت — استعانت

ذات اللہ

معبودیت و عبادت

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اتباعِ اوامر و اجتناب نواہی، قربانی، نذر و منت وغیرہ

ربوبیت و استعانت

توبہ، دعاء، توکل، صبر، شکر، خوف، رجاء، ذکر، رضا

(قرآن اور تصوف ص۵۵)

تصوّف

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اگرچہ مرزا صاحب نے یہ شعر شوخی سے کہا ہے، مگر ہم یقینی طور پر کہتے ہیں کہ غالب اگر بادہ خوار نہ ہوتے تو ولی ہوتے۔ ولی خدا کا وہ خوش نصیب بندہ ہوتا ہے جو اللہ سے محبت کرتا ہے اور کم سے کم گناہ کرتا ہے۔ سوائے نبی کے کوئی انسان معصوم نہیں ہو سکتا، اس پر صوفیائے کرام کا اجماع ہے۔ بہرحال غالب کا بلکہ ہر بندہ کا اپنے خالق سے الگ الگ معاملہ ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اس موضوع پر بحث کرنی ہے، کہ "تصوف کیا ہے" جیسا کہ ہم تعارف میں عرض کر چکے ہیں "تصوف کی اصل قرآن ہے" احادیث میں اس کی تشریح ہے"۔ "تصوف" دل کی صفائی" کو کہتے ہیں۔ قرآن کے محاورہ میں اس کو "قلب سلیم" کہتے ہیں۔ قرآن میں رسول پاکؐ کے دنیا میں آنے کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے "یُزَکِّیھِم" آپ کو دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے تاکہ آپ بندوں کے قلوب کو کفر و شرک و گناہ کی آلودگیوں سے پاک صاف کریں، اس کے بعد آیت میں "کتاب وحکمت" کا ذکر ہے یعنی پہلے قلب کی صفائی لازمی ہے اس کے بعد ہی کتاب (قرآن) وحکمت (حدیث) کا درس دیا جا سکتا ہے۔ ایک آیت ہے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا" وہی بندہ فلاح تک پہونچے گا جس نے اپنے دل کو کفر و شرک اور گناہوں سے پاک رکھا ——— علامہ شبلی "الغزالی" میں لکھتے ہیں کہ

"تصوف کا لفظ اصل میں "سین" سے تھا اور اس کا مادّہ "سوف" تھا جس کے معنی یونانی زبان میں "حکمت" کے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ لفظ عربی میں آیا۔ چونکہ حضرات صوفیا میں اشراقی حکماء (افلاطون، ارسطو وغیرہ) کا انداز پایا جاتا تھا اس لئے لوگوں نے ان کو "سوفی" یعنی حکیم کہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ سوفی سے "صوفی" ہو گیا۔ تصوف علم باطن ہے لیکن اس کے نتائج عجیب و غریب ہیں جو مقامات سے تعبیر کئے جاتے ہیں۔ مثلاً خدا کا ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا، چونکہ اسلام کے عقائد میں شامل ہے، عالم و جاہل، عام و خاص سب اس پر اعتقاد رکھتے ہیں لیکن عام لوگوں کو چونکہ اس مسئلہ کا علم تقلید یا استدلال سے ہوتا ہے اس لئے اس سے کوئی خاص حالت پیدا نہیں ہوتی افعال و اعمال پر چنداں اثر نہیں پڑتا۔ برخلاف اس کے تصوف میں اس مسئلہ کا علم مشاہدہ اور کشف سے حاصل ہوتا ہے یعنی صوفی کو درحقیقت چاروں طرف خدا ہی خدا نظر آتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر خشوع و خضوع، ہیبت و خوف، ادب و انقیاد کی وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جو کسی طرح علم ظاہری سے پیدا نہیں ہو سکتی"۔

قرآن میں ہے یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ اللہ اپنے مخلص بندوں سے محبت رکھتا ہے اور وہ اُس سے محبت رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت جبرئیلؑ ایک نووارد مسافر کی شکل میں حضورؐ کی خدمت میں آئے۔ اسلام و ایمان کے متعلق پوچھنے کے بعد دریافت کیا "احسان" (تصوف) کیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا تَعْبُدُ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (یعنی اپنے رب کی عبادت اس طرح کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے، اگر اتنا مرتبہ تجھے حاصل نہیں تو یہ یقین کر کہ وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے صحابہؓ نے اکثر ذکر کیا کہ حضورؐ کے سامنے ہماری حالت ایسی ہو جاتی تھی گویا ہم جنت اور دوزخ کو دیکھ رہے ہیں اور جب اپنے بال بچوں کے پاس پہونچ جاتے تھے اس وقت

ہماری حالت ایسی نہیں رہتی تھی۔ اس کو تصوف میں علم حضوری کہتے ہیں۔ دیکھئے صحابہؓ پر یہ حالت طاری ہوتی تھی مگر وہ اس کا نام نہیں جانتے تھے۔ ایک مرتبہ حضورؐ سے بھی عرض کیا کہ آپؐ کے سامنے ہماری جو حالت ہوتی ہے وہ گھر پہونچ کر نہیں رہتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ اگر تمہاری حالت ہر وقت ایسی ہی رہتی تو تم سے راستہ میں فرشتے ملاقات کرنے لگیں اور تم کھانا پینا، راحت و آرام سب چھوڑ دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ علم باطن ہے، یہ اُس حالت کا نام ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

بخاری نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ ٹھیک رہا تو سارا جسم ٹھیک رہے گا اگر وہ خراب ہوا تو سارا جسم خراب ہو جائیگا، یاد رکھو وہ قلب ہے۔ فصاحت اس کو کہتے ہیں۔ اگر ظاہری دل مراد لیجئے تب بھی یہی مطلب ہے اور اگر روحانی قلب مراد لیجئے تب بھی یہی مطلب ہے، کہ اگر انسان کو قلب کی صفائی حاصل ہو گئی تو انسان میں ہزاروں اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں۔

۷۔۸ امام غزالیؒ تصوف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اس کے ذریعہ قلب کو غیر اللہ سے خالی کیا جائے اور اس کو ذکرِ الٰہی سے آراستہ کیا جائے۔"

مختصر یہ کہ قلب اخلاقِ ذمیمہ سے پاک ہو اور اخلاق حسنہ سے آراستہ ہو۔ امام غزالیؒ نے ظاہری (اکتسابی) علم کی مثال یہ دی ہے کہ کسی پردے پر خوبصورت نقش بنے ہوئے ہیں اور تصوف (صفائی قلب) کی مثال یہ دی ہے کہ اُس پردہ کے سامنے آئینہ رکھ دیا جاتے اور وہ نقوش اُس آئینہ میں نظر آنے لگیں۔ صحابہ کو بھی تصوف حاصل تھا مگر اس وقت تک "تصوف" کا محاورہ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ بعض صحابہ کو "مشاہدہ" ہوتا تھا۔ یہ ایک حالت ہے جس کے معنی ہیں کہ بندے پر ایسی حالت طاری ہو جائے گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

حق سبحانہ کا مقصد حالت پیدا کرنا ہے نام جاننا ضروری نہیں۔

حضورؐ کے بعد مسلمان کا سب سے بڑا مرتبہ صحابیؓ ہونا تھا، ان کے بعد تابعین کا دور آیا، پھر تبع تابعین ہوئے۔ اسی زمانے میں فلسفہ کا دور شروع ہوا۔ یونانی فلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہوئے۔ اب ہر شخص دین کی باتوں میں عقل کو دخل دینے لگا، بعض علماء نے جو یہ حالت دیکھی تو معترضین کو جواب دینے کے لئے فلسفہ پڑھا۔ پہلے محققین صرف جواب پر اکتفا کیا کرتے تھے، مگر اب خود قرآن و حدیث کی باتوں کو عقل و فلسفہ کے معیار پر پرکھنا شروع کر دیا۔ جو مسائل عقل یا حکمائے یونان کے اصول کے مطابق نہ ہوئے اُن سے یا تو انکار کر دیا، یا تاویل کرنے لگے۔ اب انتشار شروع ہو گیا۔ ہر گروہ نے اپنا جُداگانہ عقیدہ بنا لیا۔ اسی زمانے میں مُرجیہ، جُہمیہ، باطنیہ، جبریہ، قدریہ، نوریہ، مُشبّہہ، مجسّمہ، اور خارجی وغیرہ پیدا ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر فرقہ نے اپنے مسلک کی دلیل قرآن و حدیث سے پیش کرنی شروع کر دی۔ بعض نے دوسرے فرقوں کو بلکہ صحیح عقائد والوں کو بھی کافر کہہ دیا۔ ہر طرف بدعات کا ظہور ہونے لگا۔ مناظرے بلکہ مجادلے ہونے لگے صرف عقائد کے اختلاف پر بغداد کے محلّے اُجڑ گئے، خواہ مخواہ مسائل پیدا کئے اور اُن پر بحثیں شروع کر دیں: "قرآن مخلوق ہے یا نہیں"؟ اس بحث پر لوگ قتل ہونے لگے۔ امام احمد بن حنبلؒ "قرآن کو مخلوق" نہیں کہتے تھے، ان کا قول تھا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اس کی صفت ہے، اور خدا کی صفت مخلوق نہیں لہٰذا قرآن مخلوق نہیں۔" خلیفۂ وقت نے ان بے چارے کے کوڑے لگوائے، جسم سے خون بہنے لگا۔ غرض ساری داستان خوں چکاں ہے اُس زمانے میں کچھ خوش نصیب ایسے تھے جنھوں نے قرآن و سنّت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اپنی عقل پر قرآن و سنّت کو ترجیح دی۔ ان ہی حضرات نے فتنوں سے بچنے کے لئے بلکہ اپنے دین کو بچانے کے لئے گوشہ نشینی اختیار کی۔ یہی حضرات صوفیاء کہلائے۔ تاریخ

میں ہے کہ سب سے پہلے صوفی کا لقب ابو ہاشمؒ کو ملا۔ چونکہ صوفیاء میں وحدت الوجود کا مسئلہ پیدا ہو چکا تھا، حکمائے یونان خود بھی اصل (خدا) اور ظلّ (مخلوق) کو ایک سمجھتے تھے اِس لئے جہلاء کے لئے اباحت کا دروازہ کھُل گیا۔ نماز، روزہ اور دیگر تکالیف شرعیہ کو اپنے سر سے اُتار دیا، پھر خود ہی یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ بندہ جب خُدا سے قرب حاصل کر لیتا ہے تو پھر شریعت کی پابندی ختم ہو جاتی ہے۔ اس طور پر شرعی تکالیف سے بچنے کا خوب بہانہ ہاتھ آیا۔ چنانچہ عراقی کہتے ہیں ؎

صَنما رہِ قلندر سزد ار بمن نمائی　　　　که دراز و دُور دیدم رہ و رسم پارسائی

یعنی اے پیرِ طریقت مجھے قلندری کا راستہ بتلا دے کیونکہ پارسائی (زاہد بننے) کا طریقہ بہت بہت طویل اور دشوار ہے۔" "طریقت" کو "علم سینہ" قرار دیا اور "شریعت" کو "علم سفینہ"۔ شرابِ ناب سے دل بہلانے لگے، حُسن پرستی اختیار کی، قبروں کو سجدہ کرنے لگے، جاہلوں نے وحدت الوجود کے مسئلہ کو نہ سمجھ کر صاف اعلان کر دیا ہر چیز خدا ہے "ہمہ اوست"

ہم آگے اس مسئلہ کو اور واضح کریں گے مگر اس جگہ یہ نکتہ ضرور سمجھ لیجئے: "فرعون نے بھی کہا تھا "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی" (میں ہی تمہارا بڑا رب ہوں) اور حسین ابن منصورؒ نے بھی کہا "اَنَا الْحَق" (میں ہی خدا ہوں) الفاظ یکساں ہیں مگر زمین اور آسمان کا سا فرق ہے، مولانا رومیؒ بات کی تہہ کو پہونچے ہیں اور خوب کہا ہے ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

پاک لوگوں کی باتوں کو اپنی باتوں پر قیاس مت کر، کیونکہ لکھنے میں شَیر اور شِیر یکساں ہی لکھے جاتے ہیں، اوّل "شَیر" کے معنی ہیں ایک پھاڑ کھانے والا جانور، جو انسان کو کھا لیتا ہے، اور دوسرے "شِیر" کے معنی ہیں "دودھ" جس کو انسان پیتا ہے، چنانچہ مرزا غالب جب یہ ورد کرتے تھے کہ لَامَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ (اللہ کے سوا کوئی

موجود نہیں) تو اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے لَا مُؤَثِّرَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰہ کائنات میں مؤثر حقیقی اللہ سبحانہٗ ہی ہیں، اور کوئی نہیں"۔ اِس نکتہ پر ایک مرتبہ اور غور کیجئے۔

ایک حدیث صحیح ہے۔ یہ حدیث قدسی ہے یعنی الفاظ رسول اللہؐ کے ہیں اور مضمون حق سبحانہٗ کا ہے۔ فرماتے ہیں" میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے سنتا ہے، اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے، اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے پکڑتا ہے، اُس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے چلتا ہے"۔ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں" اُس کا دِل بن جاتا ہوں جس سے وہ سمجھتا ہے، اُس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے"۔ (بخاری و مشکوٰۃ)۔۔۔۔

اِس سے معلوم ہوا کہ صوفیائے کرام جو کہتے ہیں" فانی ز خویش باقی بہ حق ہو جانا" یہ تصور انھوں نے اسی حدیث سے لیا ہے۔ اسی کو "قرب و معیت" کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود صوفیائے کرام" صوفی اور تصوّف" کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ پہلے ہم صوفی کا نام لکھتے ہیں اس کے بعد اس کا قول لکھتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ:۔ صوفی، جس کا مرنا جینا محض خدا پر ہو۔

حضرت ابوبکر حریریؒ:۔ صوفی تمام اخلاقِ حسنہ کا جامع اور تمام اخلاقِ ردّیہ سے بری ہوتا ہے۔

حضرت ذو النون مصریؒ:۔ صوفی وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب کچھ چھوڑ کر خدا کو لیا ہے

حضرت منصور حلاجؒ:۔ صوفی وہ شخص ہے کہ نہ اُس کو کوئی پسند کرے نہ وہ کسی کو پسند کرے

حضرت ابومعی رودباریؒ:۔ صوفی وہ شخص ہے جو شریعتِ مصطفوی کو لازم کر لیتا ہے اور دنیا کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

حضرت زکریا رازیؒ :۔ تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیۂ نفوس، تصفیۂ اخلاق، اور تعمیر ظاہر و باطن کا علم ہوتا ہے تاکہ سعادتِ ابدی حاصل کی جا سکے۔

حضرت امام قشیریؒ :۔ تصوف، صفائی قلب، صفائی باطن و تعمیر ظاہر و باطن ہے

حضرت امام غزالیؒ :۔ تصوف، قلب کو غیر اللہ سے خالی کرنا اور ذکر الٰہی سے آراستہ کرنا ہے۔

حضرت ابو الحسن نوریؒ :۔ تصوف، حظِ نفس کو چھوڑ دینا ہے۔

حضرت محمد بن قصابؒ :۔ تصوف، اخلاقِ کریمہ ہیں، جو بہتر زمانہ ہیں، بہتر شخص سے بہتر قوم کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ :۔ صوفیا ہی مقربین ہیں۔

حضرت معروف کرخیؒ :۔ تصوف، حقائق کی گرفت اور خلق سے مایوسی ہے۔

حضرت شبلیؒ :۔ صوفی، خلق سے منقطع اور حق سے متصل ہوتا ہے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ :۔ صوفی، بلا حرکتِ اعضاء قلب مطمئن، کشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آباد، خالق سے تعلق، تمام چیزوں سے بے پرواہ۔

حضرت بایزید بسطامیؒ :۔ تصوف، دنیا کی ساری طمع کو چھوڑ دینا ہے۔

حضرت کتانیؒ :۔ تصوف، خلق کا نام ہے، جو اخلاقِ حسنہ میں بڑھ گیا وہ صفائی قلب میں بھی بڑھ گیا۔

23/11

ظاہر و باطن

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

اس عنوان کا "ہمہ اُوست" کے ساتھ گہرا تعلق ہے کیونکہ اللہ عزّ اسمہٗ کا نام "ظاہر" بھی ہے، ھُوَ الظَّاھِرُ، ظاہر کو ظاہر ہونا چاہیئے، وحدت الوجود کے قائل صوفیا یہی کہتے ہیں کہ جب وہ ظاہر ہیں تو کائنات کے پردے میں ظاہر ہیں بایں ہمہ ان کا نور اِن عنصری آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ ذاتِ پاک کو نہیں دیکھا جا سکتا صرف صفات کے پردے میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ جلوہ گری ساری آپ ہی کی ہے لیکن یہ جلوہ گری ہی پردہ بن گئی ہے۔ دوسری جگہ غالب ہی نے کہا ہے

ع ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

ایک شاعر نے ہر جگہ ان کی جلوہ آرائی دیکھ کر یہ نعرہ لگایا ہے ؎

امروز چوں جمالِ تو بے پردہ ظاہر است ‏ ‏ ‏ در حیرتم کہ وعدہ فردا برائے چیست

یعنی جب آپ کا جمال آج بھی بے پردہ نظر آ رہا ہے تو مجھے حیرت ہے کہ آپ نے فردائے قیامت کا وعدہ کیوں کیا؟

مگر اُن کی صفت "باطن" بھی ہے۔ "باطن" ان کا صفاتی نام ہے لہٰذا اُن کو صاف نظر نہ آنا چاہیئے۔ قرآن میں اس کی دلیل موجود ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنے رب سے

عرض کیا "اَرِنِی" مجھے اپنا دیدار دکھایئے، جواب آیا "لَن تَرَانِی"، تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا"۔ اس جواب سے ہی ظاہر ہے اللہ کی ذات پاک کو صاف طور پر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ قیامت اور جنت میں جو دیدار کا وعدہ کیا گیا ہے وہ بلاشبہ سچ ہے مگر چونکہ ذاتِ پاک بیچوں ہے لہذا آنکھ کسی عالم میں بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔

اب ہم اِس نکتہ کی کچھ تفصیل بیان کرتے ہیں، یہاں ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ پر غور کرنا پڑے گا، کیونکہ یہ مقام انتہائی غور و فکر کا طالب ہے۔ بات چونکہ "جلوہ گری" کی چل رہی ہے لہذا اِس کی وضاحت ضروری ہے۔

دراصل ذاتِ مطلق (ذاتِ حق سبحانہٗ) مرتبہ تنزیہہ میں نامعلوم اور ناقابلِ علم ہے جبکہ مرتبہ تشبیہہ میں قابلِ علم ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک یہی ذات پاک مختلف صورتوں میں نزول کرتی ہے مگر یہاں یہ نکتہ یاد رکھیئے کہ نزول سے مراد حلول نہیں، نزول ایک اعتباری نام ہے، ذاتِ پاک جیسی کی ویسی رہتی ہے وہ متاثر نہیں ہوتی، نزول کے بے شمار مرتبے ہیں۔ محققین صوفیاء نے ان کو چھ مرتبوں میں حصر کیا ہے ان مراتب کو تنزلاتِ ستّہ کہتے ہیں۔ یعنی ذاتِ حق سبحانہٗ کے چھ نزول۔ اب غور کیجیے۔ (۱) احدیت (۲) وحدیت (۳) واحدیت (۴) روح (۵) مثال (۶) جسم (۷) انسان۔ مرتبہ اوّل "احدیت" میں کوئی نزول نہیں، نزول دوسرے مرتبہ "وحدیت" سے شروع ہوتا ہے اور نمبر سات تک چھ نزول ہو جاتے ہیں۔ یہی "تنزلاتِ ستّہ" کہلاتے ہیں (نقشہ میں ملاحظہ فرمائیں)۔

○ احدیت" سے ذات پاک مراد ہے، احدیت کے اعتبار میں نزول نہیں۔ ذاتِ پاک حق سبحانہٗ اپنی کُنہ اور حقیقت کے لحاظ سے ناقابلِ علم ہے اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ جنت میں دیدار کر کے بھی ذاتِ پاک سبحان کو نگاہ نہیں گھیر سکے گی کسی انسان اور فرشتے کی پرواز تخیل بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اسی مقام کی نسبت حضورؐ نے فرمایا

ہے لَا تَفَکَّرُوْا فِی اللّٰہِ اللہ کی ذات پاک میں غور نہ کرو۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔..... ع۔ صد ہزاران پردہ آمد تا الٰہ " ذات حق سبحانہ تک لاکھوں پردے پڑے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے دریافت کیا تھا " کیا آپؐ نے معراج میں حق تعالیٰ کو دیکھا تھا؟ "، آپؐ نے فرمایا " نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ " وہ تو ایک نور ہیں میں ان کو کیسے دیکھتا!! احدیت کے جو نام صوفیائے کرام نے رکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذات حق کا عرفان ناممکن ہے۔ مثلاً غیب الغیوب "، " معدوم الاشارات "، " مکنون المکنون "، " خفاء الخفاء "، " قِدَمُ القِدَم "، " عین مطلق "، " ذات بلا اعتبار " وغیرہ۔ یہ لاادریت کا مرتبہ ہے۔ اسی مرتبہ کی نسبت شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں " ذات پاک کی کنہ تک پہونچنے میں ہم سب کے سب احمق ہیں۔

" وحدیت " یہاں سے نزول شروع ہوتا ہے۔ یہ اعتباری نزول ہے جو صوفیائے کرام نے اپنے کشف سے معلوم کیا ہے، اس مرتبہ کو تعین اوّل یا حقیقت محمّدیہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ حقیقت محمّدیہ ذات محمّدیہ نہیں۔ دونوں الگ الگ حقائق ہیں۔ حقیقت محمّدیہ ذات خداوندی کا مرتبۂ نزول ہے اور ذات محمّدیہ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، چونکہ حقیقت محمّدیہ کو " نور محمدی " بھی کہتے ہیں اس لئے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔ کامل نور کا ظہور چونکہ ذات محمدی میں ہوا، اور اسی کامل نور سے اشیاء کی تخلیق ہوتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نور محمدی سے اشیاء کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ذاتِ محمّدیہ سے اشیاء کی تخلیق ہوئی۔ اسکو خوب سمجھ لیجئے

" واحدیت "۔ جب صوفی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ذات پاک کو اپنے اسماء وصفات ومعلومات کی تفصیلات کا علم ہے اسی کو " واحدیت " کہتے ہیں۔ اسی کو تعین ثانی یا حقیقتِ انسانیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے احدیت ۱، وحدیت ۲، واحدیت ۳ مراتب الٰہیہ کہلاتے

ہیں۔ ذات احدیت کو "باطن" کہتے ہیں۔ روح، مثال، جسم کو "مراتب کونیہ" کہتے ہیں۔ "انسان" صوفیاء کی اصطلاح میں "مرتبہ جامعہ" ہے۔ وحدیت، واحدیت، روح، مثال، جسم کا نام "حضرات خمسہ" ہے۔ وحدت (یا وحدیت) اور واحدیت دونوں کو "ظہور علمی"۔ روح، مثال، جسم، انسان کو "ظہور عینی" کہتے ہیں۔ مثال کی تفصیل آئندہ آئے گی"

اب یہاں سمجھ لیجئے کہ ان حجابوں میں مستور ہونا حق سبحانہ کی بڑی مصلحت ہے۔ بعض دہریئے کہا کرتے ہیں "دکھاؤ خدا کہاں ہے؟ جاہل خلاباز کہتے ہیں کہ ہمیں خلا میں کہیں خدا نہیں ملا۔" ہم پوچھتے ہیں کہ اگر خدا نظر آجائے تو کسی میں دیکھنے کی طاقت ہے؟ اور اگر دیدار دوامی ہو تو کیا کوئی شخص اپنا کاروبار، کھانا، پینا، اولاد پیدا کرنا اور دیگر مشاغل کر سکتا ہے؟ پردہ ہی اس نے اس لئے چھوڑا ہے کہ مخلوق زندہ رہے۔ حضرت جبرئیلؑ نے معراج میں ٹھیک ہی کہا تھا کہ "اگر میں ذرا اور اوپر اڑ جاؤں تو تجلی جمالِ ذوالجلالی سے میرے پر جل جائیں۔ قرآن میں ہے "نگاہیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور وہ نگاہوں کو دیکھ لیتا ہے۔" کیونکہ وہ لطیف ہے ——— یاد رہے کہ وحدت اور وحدیت ہم معنی الفاظ ہیں۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے !
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے !

مرتبۂ اولیٰ (۱)	مرتبۂ ثانیہ (۲)	مرتبۂ ثالثہ (۳)	مرتبۂ رابعہ (۴)	مرتبۂ خامسہ (۵)	مرتبۂ سادسہ (۶)	مرتبۂ سابعہ (۷)
ذات	تنزلِ اوّل	تنزلِ ثانی	تنزلِ ثالث	تنزلِ رابع	تنزلِ خامس	تنزلِ سادس
اَحدیت	وَحدیت	واحدیت	روح	مثال	جسم	انسان
باطن	حقیقت محمدیہ	اعیان ثابتہ				
ایک سے تین تک مراتبِ الٰہیہ			چار سے چھ تک مراتبِ کونیہ			مرتبۂ جامعہ
	دو سے چھ تک حضراتِ خمسہ					
	دو سے تین تک ظہورِ علمی		چار سے سات تک ظہورِ عینی			
	دو سے سات تک تنزلاتِ ستہ					

ذاتِ محمدیؐ
حقیقتِ محمدیؐ
نورِ محمدیؐ

زہے شکوہ کہ اندر طراز صورتِ تو
زخود برآمدنِ صورت آفریں پیداست

رسول اللہؐ کی تعریف میں غالب کا یہ نہایت فصیح و بلیغ شعر ہے۔ یعنی اس شعر میں یہ کمال رکھا گیا ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف ذاتِ محمدیؐ بلکہ حقیقت محمدیؐ پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ "حقیقت محمدیؐ" شیخ محی الدین ابن العربیؒ کا مشکل ترین موضوع ہے۔ مگر عوام کو نور محمدی کے لفظ سے بہت دھوکا ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "اَحَد" اور "احمد" میں صرف "میم" کا فرق ہے۔ اسی لئے ہم اس کی تشریح کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

ہم پہلے غالب کے اس شعر کا مطلب بیان کرتے ہیں۔ شکوہ کے معنی ہیں شوکت و دبدبہ، شان، رعب، جلال۔ مطلب یہ ہے "اے نبی پاکؐ آپ کی صورت میں کیا رعب و جلال ہے کہ جس نے آپ کی صورت کو دیکھ لیا گویا صورت آفریں (خالق) کو دیکھ لیا۔ یہ محض شاعری نہیں بلکہ غالب نے ایک حدیث کا ترجمہ ہی کر دیا ہے

حدیث یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ یعنی بیشک اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ انسانوں میں حضورؐ سب سے زیادہ صاحبِ جمال تھے صوفیائے محققین کا خیال ہے کہ انسان مظہرِ ذاتِ احد ہے اور ساری اشیاء مظہرِ صفات ہیں۔ خود شیخ اکبرؒ کی یہی رائے ہے۔ وہ اس سے انکار کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کا مسلک وحدت الوجود ہے۔

شیخ محی الدین ابن العربیؒ نے "فتوحاتِ مکیہ" میں اس مقام کی جو تشریح کی ہے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو تصور پیش کیا ہے اس کو ہم اپنی زبان میں پیش کرتے ہیں ———— "جیسا کہ ہم" ظاہر و باطن" کے عنوان کے تحت لکھ چکے ہیں ذاتِ وحدیت کو ہی حضرت شیخ اکبرؒ "حقیقت محمدی" کہتے ہیں۔ اس کو "عقل اول" بھی کہتے ہیں۔ عقل اول تمام حقائق اشیاء پر محیط ہے۔ اس تعین اول کو حقیقت محمدیہ کیوں کہتے ہیں؟ دراصل "احدیت" اللہ کی ذاتِ محض ہے۔ یہاں ذاتِ سبحان بہت منزہ ہے بلکہ قید تنزیہہ سے بھی مقدس ہے۔ بے رنگ و بے کیف ہے۔ یہاں کوئی تنزل نہیں ہے۔ تنزل وحدیت کے مرتبہ سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ انسان بھی شئے ہے لیکن ذواتِ اشیاء میں نور کا ظہور سب سے زیادہ ذوات انسانیہ میں پایا جاتا ہے چونکہ انسانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مظہر اتم ہے کیونکہ آپ انسانِ کامل ہیں، لہذا وحدیت کا ظہور بھی یہاں کامل ہے۔ اسی لئے شیخ اکبرؒ نے اس کو ذات محمدی کی حقیقت کہا ہے۔ گویا ان کے نزدیک وحدت (یا وحدیت) کا دوسرا نام حقیقت محمدیہ ہوا۔ ابو الشیخ، طبرانی اور ابو نعیم نے یہ احادیث نقل کی ہیں۔ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ سب سے پہلے خدا نے عقل کو پیدا کیا۔ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ سب سے پہلے خدا نے میرے نور کو پیدا کیا۔ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ رُوْحِیْ سب سے پہلے خدا نے میری روح کو پیدا کیا۔" شیخ اکبرؒ اور اُن کے متبعین وحدت کو ذاتِ محمدی کی حقیقت کہتے

ہیں اسی کو حقیقت محمدیہ کہا جاتا ہے۔ حقیقت محمدی کو نور محمدی کہتے ہیں۔ ذات محمدی رسول اللہ کی ذات کو کہتے ہیں جو عبد ہے۔/

حضرت مجدد الف ثانی کہتے ہیں کہ حقیقت محمدی ظہور اوّل ہے اور حقیقۃ الحقائق ہے یعنی انبیاء کرام اور ملائکہ عظام کے حقائق اس کے ظلال کی طرح ہیں یعنی انبیاء اور ملائکہ کی حقیقتیں حقیقتِ محمدی کا پرتو ہیں۔ اسی لئے رسول اللہؐ نے فرمایا ہے اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ۔ دوسری جگہ فرمایا ہے خُلِقْتُ مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ مِنْ نُوْرِیْ میں خدا کے نور سے پیدا ہوا اور مومنین میرے نور سے پیدا ہوئے۔ لہذا حقیقت محمدی، حق جل جلالہٗ اور ساری حقیقتوں کے درمیان واسطہ ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کو تنزل اور واسطہ کی کیا ضرورت تھی براہ راست ہی کیوں پیدا نہیں کر دیا۔ اس کا جواب حضرت مجدد الف ثانی نے یہ دیا ہے کہ عالم کے پیدا کرنے کی وجہ حُبّ ہے یعنی محبت، حق سبحانہٗ کو اپنی ذات پاک سے محبت ہے وہ چاہتے ہیں کہ ان کو پہچانا جائے۔ اِس حُبّ کے باوجود ان کو عالم اور ایجادِ عالم سے اِستغنا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ نصّ قاطع ہے اور اس کا ثبوت ہے۔

تعیّنِ اوّل تعیّنِ حُبّی ہے اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ تعیّن حُب ہے۔ یہی حقیقت محمدی ہے۔ حضرت مجددؒ، حضرت صدیق اکبرؓ کی حقیقت کو بھی حقیقتِ محمدی کا ظلّ (پرتو) کہتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "حقیقت حضرت صدیقؓ یعنی رب او از اسماء الٰہی جل سلطانہٗ کہ مبدأ تعیّن اوست بے توسّط امرے ظلّ حقیقت محمدی است بر نہجے کہ ہر چہ دراں حقیقت کائن است بہ طریق تبعیت و وراثت دراں ظل ثابت" پھر فرماتے ہیں "یہی وجہ ہے کہ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ اس امت میں سب سے افضل اور اکمل ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا ہے" اللہ تعالیٰ نے جو کچھ میرے سینہ میں ودیعت فرمایا ہے وہی

اللہ نے ابوبکر صدیقؓ کے سینہ میں رکھ دیا ہے۔ حقیقت اسرافیلی بھی وہی حقیقت محمدی ہے۔ اس کے بعد وضاحت کی ہے کہ رسولِ پاکؐ کے سینہ میں کلیت ہے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سینہ میں جزئیت ہے، بس دونوں میں یہی فرق ہے۔

جو لوگ ذاتِ محمدیؐ اور حقیقت محمدیؐ کو ایک سمجھتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ذات محمدیؐ (رسول اللہ کی ذات پاک) عالم امکان میں ہے۔ حقیقت محمدی ذاتِ خداوندی ہے۔ امکان، حقیقت نہیں بن سکتا۔ یہ موقع بہت نازک ہے اس لئے ہم حضرت مجددؒ کے اصل الفاظ نقل کرتے ہیں۔ دراں حالیکہ یہ تصور انھوں نے حضرت شیخ اکبرؒ سے لیا ہے۔ حضرت مجدد کے الفاظ بعینہ یہ ہیں: "آنحضرت علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام نیز با علوئے شان و باآں جاہ وجلال ہمیشہ ممکن است و ہرگز از امکان نہ خواہد بر آمد۔ وجوب نہ خواہد پیوست" یعنی آنحضرت علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام باوجودیکہ ان کی شان بہت اعلیٰ ہے اور حضورؐ بہت جاہ وجلال رکھتے ہیں تاہم امکان (مخلوق) سے اوپر ہو کر واجب (حق) نہیں بن سکتے" یعنی بندہ بندہ ہی رہے گا اور رب، رب رہیگا۔ اس موقع پر ہم پھر شیخ محی الدین ابن العربیؒ کا قول یاد دلاتے ہیں کہ "بندہ بندہ ہی رہیگا خواہ کتنی ہی ترقی کرے اور رب رب ہی رہے گا خواہ کتنا ہی تنزل کرے۔ لہذا ذاتِ محمدیؐ ۔ حقیقتِ محمدیؐ (یا نورِ محمدیؐ) نہیں بن سکتی۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ ذاتِ محمدیؐ اور نورِ محمدیؐ دو الگ الگ حقائق ہیں دونوں کو ایک سمجھ لینا یا محمدؐ کا رتبہ رب کی برابر قرار دینا الحاد ہے، زندقہ ہے، کفر ہے۔ جامیؒ نے رسول اللہؐ کی شان میں خوب کہا ہے۔ ع... بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

تقدیر

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

تقدیر، اسلام میں بہت معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ عام مسلمانوں میں تقدیر کے متعلق اس قدر غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اگر ہم کو غالب کا یہ شعر نہ ملتا تو بھی ہم اس مسئلہ پر الگ بحث کرتے۔ ہم نے تو بعض تعلیم یافتہ حضرات کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ "تقدیر" اسلام کا بہت کمزور مسئلہ ہے، عام مسلمان تو تقدیر پر بھروسہ کر کے بے عمل بن گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اپنی جان کو مصیبت میں ڈالنے سے کیا فائدہ، جو قسمت میں ہے وہ تو ملے گا ہی۔ بعض احمقوں کو دولت ملتی دیکھ کر عام آدمیوں کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہے بس تقدیر ہے، جدوجہد بالکل بیکار ہے۔ ایسے لوگوں کو مجمل طور پر صرف اتنا معلوم ہونا چاہیئے کہ "تقدیر" خالق کی معلومات کو کہتے ہیں جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

تقدیر کے متعلق غالب کا یہ شعر بے نظیر ہے۔ اس شعر کے مقابلہ میں جب ہم انشا کے شعر پر نظر ڈالتے ہیں تو فرق بعد المشرقین نظر آتا ہے۔ انشا کہتے ہیں ۔

قسمت میں جو لکھا ہے وہ پہونچے گا آپ سے پھیلایئے نہ ہاتھ، نہ دامن پساریئے

رسول اللہ ﷺ سے زیادہ تقدیر کو کون سمجھے گا مگر پوری زندگی پر نظر ڈالئے ساری عمر جدوجہد اور سعی پیہم میں گذری، حضورؐ سے زیادہ متوکل کون ہو گا مگر آپؐ کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھے۔ باوجودیکہ آپؐ نے تقدیر پر ایمان لانے کی تلقین کی ہے۔ غالب کا یہ شعر بھی اتنا ہی

مشکل ہے جتنا اقبال کا یہ شعر ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

پہلے غالب کے شعر کا ظاہری مطلب سمجھئے۔ اس شعر میں تصوف اس طرح بند کر دیا گیا ہے جس طرح کوزے میں دریا کو۔ یا بقول شیخ محی الدین ابن العربیؒ "گٹھلی میں درخت کو"۔ توفیق کہتے ہیں انسان کے اس ارادے کو جو خالق کے ارادے کے موافق ہو جائے۔ ازل میں جس ہستی (خصوصاً انسان) کی جو ہمت تھی اسی کے مطابق اس کی تقدیر بنی۔ ایک قطرہ آنکھ کا آنسو بنا، دوسرا قطرہ صدف میں گوہر بنا، دونوں قطروں کی تقدیر دونوں کی ہمت کے مطابق بن گئی / ——— ازلی ہمت کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے چند حقائق ذہن میں رکھنے ہوں گے۔ تقدیر کے معنی ہیں "اندازہ"۔ خداوند عالم نے کائنات کو پیدا کرنے سے پہلے اس کا اندازہ کر لیا تھا۔ یہی اندازہ غالب کے نزدیک وہ نقش ہے جو نقاشِ ازل کے ذہن میں تھا اور اس کے بعد عالم شہود میں جلوہ گر ہوا۔ امام غزالیؒ کا تصور یہ ہے کہ تقدیر لوح محفوظ میں اس طرح لکھی ہوئی نہیں ہے جس طرح کوئی تحریر تختی پر لکھی ہوئی ہوتی ہے بلکہ وہ تحریر خدا کے علم میں ایسی ہے جیسے حافظ قرآن کے دماغ میں قرآن لکھا ہوا ہوتا ہے / واقعی یہ قرآن حافظ کے دماغ میں ہے لیکن کوئی "ایکسرے" ایسا ایجاد نہیں ہوا ہے جو اس کی تصویر اتار لے۔

اس کو ہر زمانے کے مسلمان مانتے چلے آئے ہیں کہ خدا کا علم بسیط ہے اس کے سامنے کائنات "کھلی ہوئی کتاب" کی طرح ہے۔ اس کے سامنے ظاہر و باطن ایک ہی درجہ رکھتے ہیں یہ سب کچھ اسی کے علم کے مطابق ہوگا۔ انسان جو کچھ بھی عمل کرے گا وہ بھی خدا کے علم کے مطابق ہوگا مگر اس کیفیت کی تعبیر میں سوائے اہل سنت کے سب نے ہی ہر زمانے میں غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً جبریہ فرقہ کے علماء کہتے ہیں "انسان خدا کے علم کے مطابق ضرور عمل کرے گا

اس میں وہ مجبور محض ہے۔ ان کی نظر سے قرآن کی یہ آیت اوجھل ہوگئی ہے فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ جو چاہے مومن ہو جائے اس کے اختیار میں ہے۔ اس فرقے کے مقابلے میں دوسرا فرقہ معتزلہ ہے اس عقیدے کے لوگ اب بھی ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ اس فرقہ کا تصور یہ ہے کہ انسان اپنے فعل میں خود مختار ہے بلکہ اپنے فعل کا خود خالق ہے۔ اگر اس عقیدہ کو مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان خدا سے زیادہ چیزیں پیدا کر سکتا ہے مثلاً انسان سارے دن کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے وہ ان سارے افعال کا خالق سمجھا جائے گا کیونکہ ان کے نزدیک خدا انسان کے ان افعال کا خالق نہیں، دراں حالیکہ اس عقیدہ کے خلاف قرآن کی یہ آیت موجود ہے وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ اور اللہ نے تم کو بھی پیدا کیا اور جو کچھ عمل تم کرتے ہو ان کو بھی پیدا کیا۔

اگر قرآن و حدیث پر صحیح طور پر عمل کرنا ہے تو ساری آیات و احادیث کو سامنے رکھنا ہوگا۔ انسان بلاشبہ اپنے ارادے میں آزاد و خود مختار ہے مگر اس کو شتر بے مہار نہیں چھوڑا گیا ہے، دوسری طرف اس قدر مجبور نہیں جیسے قلم کاتب کے ہاتھ میں۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کو جزا و سزا کیسی؟ خداوند کریم ظلم نہیں کرتے کیونکہ جبر ظلم ہے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ خدا کی نسبت بندہ سے ایسی نہیں جیسے بڑھئی اور تخت کی ہوتی ہے بلکہ خالق اور مخلوق کا تعلق دائمی اور قریبی ہونا ضروری ہے، اس کی ذات پاک قیوم ہے، اسی وجہ سے نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات قائم ہے۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بالکل صحیح فرمایا ہے اَلْاِسْلَامُ بَيْنَ الْجَبْرِ وَالْاِخْتِيَارِ اسلام جبر اور اختیار کے درمیان ہے۔ "خدا کی معلومات ازلی ہیں ہمیشہ سے ہیں معلومات الٰہی کے مطابق واقعات کا ظہور ہونا لازمی ہے مگر معلوم ہونا جبر و ظلم نہیں۔ اگر کسی ہستی کا علم اس قدر وسیع ہے کہ ابد تک کے حالات کو جانتی ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ فلاں شخص کو

اچھے اعمال کی وجہ سے جنت ملے گی اور فلاں آدمی بُرے اعمال یا فاسد عقائد کی وجہ سے دوزخ میں جائے گا تو یہ ہرگز ظلم نہیں۔ حق سبحانہٗ کو معلومات ہونے کے ساتھ قدرت بھی ہے وہ جس بندے سے خوش ہوں اس کو بُرائیوں اور ہلاکتوں سے بچا سکتے ہیں اور بچاتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کسی جگہ جانے والے تھے وہاں طاعون پھیلا ہوا تھا یہ سن کر وہ واپس ہونے لگے، ایک شخص نے کہا "کیا تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا بَلٰی نَحْنُ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ اِلٰی قَدَرِ اللّٰہِ (ہاں ہم تقدیر الٰہی سے تقدیر الٰہی کی طرف ہی بھاگ رہے ہیں) یعنی یہاں تک میرا آنا اور اب یہاں سے واپس جانا سب تقدیر میں تھا۔

ہمت کیا ہے؟ ہمت دراصل "عین" ہے۔ اس کو تصوف میں "عین ثابتہ" کہتے ہیں۔ ہر انسان اپنے عین کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حق سبحانہٗ ازل سے عالم ہے، اس کا علم ازلی ہے یعنی ہمیشہ سے ہے، علم بغیر معلومات کے ناممکن ہے علم ازلی ہوا تو معلومات بھی ازلی ہوئیں۔ علمِ حق سبحانہٗ کی صفت ہے، صفت ذات سے منفک (جدا) نہیں ہوسکتی۔ حق سبحانہٗ کی ان ہی معلومات کو صوفیاء "اعیان ثابتہ" "صُوَرِ علمیہ" "حقائق الممکنات" یا "ازلِ ممکن" کہتے ہیں۔ اعیان، عین کی جمع ہے، ہر شئے کا ایک عین ہے اور ہر عین کی ایک خصوصیت ہے اسی خصوصیت کو فطرت کہتے ہیں۔ عین کی قابلیت یا اقتضائے ذاتی کو قرآن کی زبان میں "شاکلہ" کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ، ہر شخص اپنے اقتضائے ذاتی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ غالب اسی شاکلہ کو "ہمت" کہتے ہیں۔ یعنی توفیق ہر شخص کے اقتضائے ذاتی کے مطابق ہوتی ہے اور اسی کے مطابق وہ عمل کرتا ہے۔

تخلیق کیا ہے؟ حق سبحانہٗ کی معلومات یا اعیانِ ثابتہ کا خارج میں انکشاف۔

اس نکتہ پر پھر غور کیجئے اور اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ ہر انسان کا عین الگ الگ ہے بلکہ

گھوڑے، مرغ، شیر کے اعیان الگ الگ ہیں۔ ہر ذی روح اپنے عین کے مطابق عمل کرے گا۔
اس حد تک جبر ہے جیسا کہ سفید رنگ، طویل القامت ہونا، پست قامت ہونا، کم عقل ہونا اس حد تک مجبوری سے عمل میں کوئی مجبوری نہیں۔ قطرہ جو موتی بنا اس کا عین اور تھا، جو قطرہ آنکھ کا آنسو بن گیا اس کا عین دوسرا تھا، ہر قطرہ کی ازلی ہمت اسی کی متقاضی تھی اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بادشاہوں کی اولاد کی فطرت میں ملک گیری ہوتی ہے ایک گداگر یا معمولی آدمی بادشاہ بننے کی تمنا کر ہی نہیں سکتا۔ شیخ محی الدین ابن العربیؒ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "کسی عین کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی خصوصیت اہلیت اور ذاتی استعداد کے سوا کسی اور وجود میں ذاتی اور صفاتی اعتبار سے ظاہر ہو جائے" (فصوص الحکم)۔ ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہے اگرچہ ارادہ میں آزاد ہے مثال کے طور پر سمجھ لیجئے کہ انسان سے شیر، گھوڑے اور مرغ وغیرہ جیسے کام نہیں ہو سکتے خواہ وہ ساری عمر دعائیں مانگتا رہے۔ انسان اپنے فعل کا کاسب ہے خالق نہیں، بہ خلاف معتزلہ۔ انسان کی صرف وہ دعائیں قبول ہوتی ہیں جو اس کے اقتضائے ذاتی کے مطابق ہوں۔ مثلاً کوئی معمولی آدمی یہ دعا مانگنے لگے کہ وہ کسی ملک کا بادشاہ بن جائے تو یہ دعا قبول نہ ہوگی کیونکہ ایسا مانگنا گویا اس کے عین کے خلاف ہوگا۔ دیکھئے کس قدر بلیغ آیت ہے وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ۔ شیخ اکبرؒ کی اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں۔ یعنی پروردگار نے وہ سب کچھ تم کو عطا کیا ہے جو تمہارے عین نے بزبانِ استعداد سے مانگا تھا۔ علامہ اقبال اپنی فلسفیانہ کتاب RECONSTRUCTION میں لکھتے ہیں۔
"تقدیر کوئی قوت قاہرہ نہیں جو خارج شئے پر بہ جبر عمل کر رہی ہو بلکہ وہ خود شئے کی باطنی رسائی ہے، اس کے وہ قابل تحقق امکانات ہیں جو اس کی فطرت میں مضمر ہیں جو بغیر خارجی جبر کے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں"۔

علامہ اقبال واضح طور پر کہہ رہے ہیں "تقدیر بہ جبر کسی پر مسلط نہیں کی جاتی بلکہ انسان کے عین کا تقاضا ہے، ان الفاظ کو بدل کر انھوں نے عوام کو سمجھانے کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں" وہ خود شئے کی باطنی رسائی ہے" یعنی انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے وہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے مشہور فقرہ ہے" ازماست کہ برماست" ہم کو جو کچھ بھی برا یا بھلا ملتا ہے وہ خود ہماری فطرت کے تقاضے سے ملتا ہے باہر سے کوئی چیز مسلط نہیں کی جاتی۔

شیخ محی الدین ابن العربیؒ فصوص الحکم میں فرماتے ہیں اِنَّ الْحَقَّ لَا یُعْطِیْہِ اِلَّا مَا اَعْطَاہُ عَیْنَہٗ یعنی حق تعالی کسی انسان کو وہی سب کچھ عطا فرماتے ہیں جو اس کا عین (اقتضائے ذاتی) عطا کرتا ہے۔ حق سبحانہٗ کی عطا اس کے عین سے آگے نہیں بڑھتی اقبال کے اس مشہور شعر کے معنی اس جگہ معلوم ہوں گے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

عوام سمجھتے ہیں کہ خودی جب بلند ہو جاتی ہے تو خدا بندے سے زبان قال سے پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے تاکہ اسی طرح کیا جائے۔ یہ غلط ہے ایسا مطلب اس شعر کا ہو ہی نہیں سکتا۔ خودی کو بلند کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے عین کو سمجھے بالفاظ دیگر اس کی ازلی ہمت کیا ہے، اس ازلی ہمت سے زیادہ اسے کچھ نہیں ملے گا بلکہ خودی کو سمجھنے والا اس سے زیادہ مانگ ہی نہیں سکتا، کیونکہ اس کی فطرت کا تقاضا نہیں اور جو فطرت کا تقاضا ہے وہی تقدیر ہے۔

تقدیر کے مسئلہ کو ایک مرتبہ اور سمجھ لیجئے کیونکہ عوام میں اس مسئلہ پر بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے حق سبحانہٗ کی معلومات اور بات ہے اور کسی بندہ کو یا پوری قوم کو نعمتوں میں رکھنا یا تکلیف میں مبتلا کرنا اور بات ہے، خالق ہر کام حکمت سے کرتا ہے ضروری نہیں کہ بندے ہر مصلحت کو سمجھ ہی جائیں۔ دیکھو ماں اپنے بچے کو نہلاتی ہے اس کا میل اتارتی ہے بچہ

روتا ہے اور اپنی نادانی سے یہ سمجھتا ہے کہ ماں اُس پر ظلم کر رہی ہے مگر عاقل سمجھتا ہے کہ ماں اُس کے ساتھ بھلائی کر رہی ہے۔ بعض تکلیفوں کے اچھے نتائج بندے کو خود بھی معلوم ہو جاتے ہیں مگر ہر بات میں عقل اور احساس کی ضرورت ہے۔ بعض واقعات کا نتیجہ کئی کئی سال کے بعد نکلتا ہے بلکہ بعض دعائیں بندے کی اس لئے قبول نہیں ہوتیں کہ اگر ان کو قبول کر لیا جائے تو اس سے دعا مانگنے والے کو نقصان پہونچ سکتا ہے کیونکہ حق سبحانہٗ خبیر ہیں ان کے سامنے ہر بندے کی زندگی ازل سے ابد تک کھلی ہوئی ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہر شخص کا ایک "عین" ہے، ہر شخص کی ایک استعداد ہے اس کے مطابق اس کو بارگاہ خداوندی سے ملتا ہے، اگر ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق معاملہ نہ کیا جائے تو وہ ہلاک ہو جائے۔ تقدیر کو ماننے سے آدمی مطمئن رہتا ہے جو کچھ ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ تقدیر میں ایسا ہی ہونا تھا اور جو کام نہیں ہوتا تو وہ سمجھتا ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بہ الفاظ دیگر خدا کے علم سے باہر کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے تو وہ ہوگا ہی، پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ۔ خود چند صحابہؓ نے یہی کہا تھا اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ "عمل کئے جاؤ ہر شخص اُس تک آسانی سے پہونچ جائے گا جو کچھ اس کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اسلام کے سب سے بڑے صوفی فلسفی شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ تقدیر کے مسئلہ کو بزرگ ترین علوم میں سے ایک علم قرار دیتے ہوئے "فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں :-

"تقدیر کا راز، عظیم ترین علوم میں سے ہے حق تعالیٰ اِس علم سے اُسی کو آگاہ کرتے ہیں جس کو انھوں نے اپنی معرفت کے لئے مخصوص کر لیا ہے،،

شیخ کا یہ اشارہ اپنی طرف ہے اور ہم نے بھی جو کچھ اس مسئلہ پر لکھا ہے سب ان کے ہی

دسترخوان کی ریزہ چینی ہے۔ ورنہ خود ہم اس قابل نہیں ہیں۔

ایک مرتبہ چند صحابہؓ نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا "ہم جو جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور دوائیں استعمال کرتے ہیں کیا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو پھیر سکتی ہیں؟" آپؐ نے فرمایا "یہ بھی حق سبحانہٗ کی تقدیر سے ہی ہوتا ہے (ابن ماجہ و ترمذی و احمد)

ایک مرتبہ حضورؐ نے فرمایا "کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس پر ایمان نہ لائے کہ خیر و شر دونوں اللہ نے پیدا کئے ہیں (بخاری و مسلم)

(خیر و شر کے عنوان کے تحت الگ بحث کی گئی ہے اس پر بھی غور کیجئے)

اس موقع پر یہ معلوم کیجئے کہ سب انسان اپنی فطرت اور اقتضائے ذاتی کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ ایک باہمت شخص چند رفیقوں کی مدد سے ایک ملک پر قبضہ کر سکتا ہے اور ایک بزدل کسی بہادر کی طرف دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مگر خدا کی بارگاہ عالیہ سے اجر دونوں کو ملتا ہے۔ اعمال اور کسب میں سب کا مرتبہ ایک ہے۔ قرآن میں واضح الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا لَہَا مَا کَسَبَتْ۔ — اللہ تعالیٰ کسی کو بھی اس کی گنجائش (فطری طاقت) سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اسکو وہی ملتا ہے جو اس نے کیا ہے۔ (سورۂ بقر)۔

امام حسنؓ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ کی اطاعت بہ جبر نہیں ہو رہی ہے اور نہ اُن کی نافرمانی میں قوتِ قاہرہ کار فرما ہے"

اس راز کو علامہ اقبال نے "جاوید نامہ" میں خوب بیان کیا ہے ؎

ارضیاں نقد خودی در باختند — نکتۂ تقدیر را نشناختند

رمز باریکش بہ حرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی او دیگر است

رو تا

خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا   سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا

شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست   قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست

یعنی تقدیر کا ایک باریک راز یہ ہے کہ تم جو کچھ بھی اپنی فطرت کے مطابق ہو ویسا ہی عمل تم سے ہوگا۔ اگر تم مٹی بن جاؤ تو ہوا میں اُڑ جاؤ گے، اگر پتھر بن جاؤ تو ہوا میں نہیں اُڑ سکتے مگر شیشہ پر پھینکے جا سکتے ہو۔ اگر تم شبنم ہو تو تمہاری قسمت میں اوپر سے نیچے گرنا اور فنا ہو جاتا ہے، اگر تم دریا ہو یا سمندر ہو تو تمہاری تقدیر میں پایندگی اور بقا ہے۔ یعنی تمہاری تقدیر اقتضائے فطرت کے مطابق ہوگی۔

انسان اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ تقدیر کی وجہ سے مجبور ہے حالانکہ وہ اپنی قابلیات (عین) کے لحاظ سے مجبور نہیں بلکہ وہ اس موہومہ "تقدیر" کو بھی توڑ سکتا ہے۔

اقبال نے ایسے عقیدے رکھنے والوں کو یوں جھنجھوڑا ہے ؎



تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں

نادان جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

فنا۔ بقا

"ہمہ اوست" "ہمہ از وست"

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ اَنَا الْبَحْر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

"دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر" یہ وحدت الوجود ہے اس کو توحید وجودی بھی کہتے ہیں، "ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا" یہ وحدت الشہود ہے اس کو توحید شہودی بھی کہتے ہیں "وحدت الوجود" کے عقیدے میں صوفیاء افلاطون کے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ وحدت الوجود والوں کا "حال" یہ ہوتا ہے کہ ہر چیز خدا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی ساری مثنوی اسی عقیدے کی گویا تشریح ہے۔ یہ صوفیاء کا بڑا معرکۃ الآراء مسئلہ ہے۔ چشتیہ صابریہ کا مسلک تو وحدت الوجود ہی ہے۔ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ زاہد خشک مشہور ہیں لیکن جہاں تک "حال" کا تعلق ہے وہ اس مسئلہ پر یہ الفاظ بے ساختہ لکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں

"جس طرح لوہے کے ٹکڑے کو آگ میں ڈال دیتے ہیں تو وہ لوہے کا ٹکڑا آگ کے انگاروں کے شمار میں ہو جاتا ہے، لیکن نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ لوہا اپنی حقیقت کو چھوڑ کر خالص آگ کی حقیقت سے بدل گیا ہے، کیونکہ یہ امر تو صریح البطلان ہے بلکہ یہ لوہے کا ٹکڑا

فی الحقیقت لوہا ہی ہے ۔۔۔ اگر اِس حال ہی میں اس آہن پارہ
کو بولنے کی طاقت ہوتی تو تنو زبان کے ساتھ اپنی اور آگ کی عینیت
اور یکجان ہونے کا شور مچاتا اور خواہ مخواہ ایک ساعت کے لئے اپنی
حقیقت سے غافل ہو کر یہ کلمہ بول اٹھتا کہ میں جلانے والی آگ کا انگارہ
ہوں ، باورچیوں ، لوہاروں ، سناروں بلکہ سارے پیشہ ور کاریگروں کے
کاروبار میرے ساتھ وابستہ ہیں ۔ جب اس طالب کے نفس کو رحمانی کشش
اور جذب کی موجیں احدیت کے دریاؤں کی گہری تہہ میں کھینچ لے جاتی ہیں تو
" اَنَا الْحَق " (میں خدا ہوں) اور لَیْسَ فِی جُبَّتِی سِوَی اللہ (میرے
پہلو میں اللہ کے سوا کچھ نہیں) کہتا ہے ۔ خبردار ! اس معاملہ پر تعجب
نہ کرنا اور انکار سے نہ پیش آنا جبکہ وادی مقدس کی آگ سے آواز
اِنِّی اَنَا اللہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ صادر ہوئی تو پھر اشرف موجودات
(یعنی انسان) جو حضرت ذات سبحانہٗ تعالیٰ کا نمونہ ہے اگر " اَنَا الْحَق "
کی آواز صادر ہو تو کوئی تعجب کا مقام نہیں ۔ " (صراط مستقیم صفحہ ۱۴) ۔

یہی ہمہ اوست کا مقام ہے ۔ ہمہ اوست عقیدہ نہیں ، حالت ہے ، سالک کا مشاہدہ ہے مقام فنا ہے جو عارف کو پیش آتا ہے ، یہ حالتِ سُکر (بیہوشی) ہے ، جب ہوش آتا ہے جس کو " صحو " کہتے ہیں تو سالک ، خالق اور بندہ کو الگ الگ دیکھتا ہے ۔ یہی مقامِ " بقا " کہلاتا ہے ۔ حضرت مجدّد وحدتِ شہودی کا عقیدہ رکھتے تھے وہ فرماتے ہیں منصور نے جو " اَنَا الْحَق " کہا اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں خدا ہوں ، بلکہ ان کا منشاء دراصل یہ تھا کہ " من نیستم و موجود حق است " یعنی میں نہیں ہوں حق ہی حق ہے / حق ہی موجود ہے ، میری حقیقت عدم ہے ۔ حق وجود ہی وجود ہے ۔۔۔۔۔ اس اجمال کی

تفصیل یہ ہے کہ خالق اور بندہ میں ایسی نسبت نہیں کہ جو بڑھئی اور تخت میں ہوتی ہے بلکہ پیدا کرنے کے بعد اللہ بندہ سے قریب رہتا ہے مگر دونوں ایک نہیں ہو سکتے، نہ اللہ بندہ میں یا کسی شئے میں حلول کرتا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ذات کا شہود بغیر صفات کے ممکن نہیں، ذات حق سبحانہ صفات سے ہی ظاہر ہو سکتی ہے۔

تخلیق، نام ہے حق تعالیٰ کی معلومات یا اعیان کا خارج میں انکشاف"۔ شیخ محی الدین ابن العربیؒ "فتوحات مکیہ" میں لکھتے ہیں" اللہ تعالیٰ نے عالم کو نہایت استوار اور مضبوط پیدا کیا ہے۔ انسان مجموعۂ عالم ہے اور اللہ تعالیٰ کو عالم کا جو علم ہے وہ اپنی ذات ہی کا تو علم ہے، کیونکہ وجود اُس کے اور اُس کے فعل کے سوا کسی کا نہیں۔ پس ضروری ہے کہ آدم اُس کی صورت پر ہو۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی عین ثابتہ پر کی تو یہ عین اُس کا مُجلّٰی یا تجلّی گاہ بن گیا، پس عالم جمال اللہ ہے اور اللہ اپنے ہی جمال کا مُحبّ ہے، اب جو بھی عالم کو اِس نظر سے محبوب رکھتا ہے وہ جمال حق اور صورتِ جمال ہی کو محبوب رکھتا ہے"۔

صوفیاء کے نزدیک بندہ کی ذات و صفات، حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا ظِلّ ہیں، بندہ کی صفات محض اعتباری و مجازی ہیں۔ شیخ اکبرؒ (شیخ محی الدینؒ) فرماتے ہیں "وجودنا بہٖ وظہورہٗ بنا ہمارا وجود اُس کی ذات پاک کی وجہ سے ہے اور اس کی ذات کا ظہور ہم سے ہے"۔

ان سطور سے واضح ہو گیا ہو گا کہ خالق اور بندہ کی نسبت بڑھئی اور تخت کی نہیں بلکہ بہت گہری ہے۔ مگر یہاں پھر یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ اصل اور ظِلّ دونوں ایک ہیں، جیسا کہ افلاطون کا خیال ہے۔ لہٰذا اِس خیال کو دور کرنے کے لئے شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں "بندہ کتنی ہی ترقی کرے بندہ ہی رہے گا اور اللہ کتنا ہی تنزل کرے اللہ ہی رہے گا"۔

"ہمہ اوست" کے عقیدے کو پیش نظر رکھ کر اور نہ سمجھ کر صوفیائے خام یوں کہنے لگتے ہیں "خود کوزہ و خود کوزہ گر، خود ہی سودا خود ہی خریدار، خود ہی بیمار خود ہی تیماردار، سب یار کا جلوہ ہے" ـــــــــــ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں یہ سب بہ اعتبار مشاہدۂ سالک کے ہوتا ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں۔ اللہ اور مخلوق میں حقیقتاً غیریت ہے عینیت نہیں۔ عینیت عقیدہ نہیں، حال ہے۔ منصور نے جلوہ کی تاب نہ لاکر "اَنَا الحق" کا نعرہ لگایا۔ اِسی نکتہ کو غالبؔ کس لطیف انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلید تُنک ظرفیِ منصور نہیں

حق حقیقت میں موجود ہے اور بندہ (یا مخلوق) حقیقت میں معدوم ہے، دونوں میں غیریت ہے۔ دراصل حق تعالیٰ ذاتی طور پر مخلوق سے قریب ہے۔ جو صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ علمی حیثیت سے قریب ہے ان کا مقصود بھی یہی ہے کہ ذاتی طور پر قریب ہے کیونکہ جہاں علم ہے وہیں ذات ہے۔ جن فلاسفروں نے یہ کہا ہے کہ خدا نہ عالم سے مُتّصِل ہے نہ مُنفَصِل اِس سے یہی نکتہ مُراد ہے۔

دراصل محبّت، "عالم" کی تخلیق کا سبب ہے، جیسا کہ کُنتُ کَنزاً مَخفِیاً کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ جب عارف کو ہر جگہ خدا نظر آنے لگتا ہے اور وہ اپنی ہستی بھی فراموش کر دیتا ہے اس حالت کو "فنا" کہتے ہیں اور جب پھر وہ ہوش میں آتا ہے اور خالق و مخلوق کو الگ الگ محسوس کرنے لگتا ہے اس کو "بقا" کہتے ہیں۔ بقا کا درجہ فنا کے بعد ہے۔ فنا، راہ ہے منزل نہیں۔ اِسی لئے عراقیؔ فرماتے ہیں ؎

تُرا ز دوست بگویم حکایتِ بے پوست ہمہ از وست، و گر نیک بنگری ہمہ اوست

یعنی اب میں تجھ سے دوست کی بات کھول کر بیان کر دوں، سب کچھ اُسی کا پرتو ہے

اور اُسی کی تخلیق ہے اور تو میری آنکھ سے (یعنی جیسی میری حالت ہے اُس حالت میں) دیکھے سب کچھ وہی ہے، دیکھئے یہ عراقیؒ کا مشاہدہ ہے مگر حقیقت نہیں کیونکہ انبیائے کرامؑ نے انسانوں کو اس کی دعوت نہیں دی۔ یہ محض حال ہے اور حال کوئی کمال نہیں۔

عشق

یارب ز جنوں طرح غمے، در تنم ریز | صد بادیہ در قالب دیوار و درم ریز
ہر خوں کہ عبث گرم شود، در دلم افگن | ہر برق کہ بے صرفہ جہد، بر اثرم ریز

یارب مجھے عشق کا جنون عطا کر، میری جونگاہ اُٹھے وہ ہر جگہ یار کا جلوہ دیکھے۔ اپنے عشق سے مجھے اس قدر سرشار کر کہ نہ صرف دل میں بلکہ تن بدن میں بیابانوں کی وحشت سما جائے۔ میرے دل میں تیرے عشق کا گرم خون دوڑنے لگے، میری روح اور میرے اشعار میں بجلی کا اثر پیدا کر دے"

ایسا ہی ایک اور شعر اسی جذبہ سے سرشار ہو کر کہا ہے ؎

شنیدۂ کہ در آتش نہ سوخت ابراہیمؑ | ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

یوں تو محبت اور عشق ایک ہی چیز ہے، لیکن امام غزالیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ عشق محبت کا آخری درجہ ہے/ یعنی جب محبت میں محبوب کی طلب میں بیقراری آجائے، اس کے دیکھے بغیر چین نہ آئے، دل میں سوز پیدا ہو، آنکھوں سے آنسو رواں ہونے لگیں اس کو عشق کہتے ہیں، اسی لئے ہم نے عشق کا باب الگ رکھا ہے۔ محبت میں شدت پیدا ہو جائے اسی کو عشق کہتے ہیں۔ قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے وَالَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ یعنی بعض مومن ایسے بھی ہیں جن میں حق سبحانہٗ کی محبت شدید ہے" عشق کے متعلق بزرگوں کے مختلف اور دلچسپ اقوال ہیں جو نہ صرف

پڑھنے بلکہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

شمعِ فاتحہ از خلق نہ داریم نیاز   عشقِ من در پسِ من فاتحہ خوانم باقیست

مجھے مرنے کے بعد کسی کے فاتحہ پڑھنے کی تمنا نہیں ہے، کیونکہ میرا عشق الٰہی مجھ پر فاتحہ پڑھنے کے لئے کافی ہے۔

دانائے راز اقبالؔ کہتے ہیں ؎

علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب   عشق سکون وثبات، عشق حیات وممات

ایک صوفی کامل نے فرمایا ہے لَا شَیْخَ اَبْلَغُ مِنَ الْعِشْقِ (عشق سے زیادہ محبوبِ حقیقی کی بارگاہ میں پہونچانے والا کوئی شیخ کامل نہیں ہوگا۔" (رموزِ عشق)

خواجہ گیسو درازؒ فرماتے ہیں "عشق وہبی صرف است وبخشش خاصہ است"

یعنی عشق وہبی عنایت ہے بغیر طلب ملتی ہے گویا خاص بخشش ہے" (اسماء الاسرار)

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں "عشق ایک الفتِ رحمانی اور الہام شوق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح پر واجب کیا ہے" (رموز عشق)

کسی نے حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ سے پوچھا "عشق کیا چیز ہے؟" جواب دیا "عشق فرطِ محبت است"

دراصل انسان کے پیدا کرنے کا مقصد عشق و محبت ہی ہے، خود کائنات بالخصوص انسان محبت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، اس سے پہلے ایک حدیث قدسی آپ پڑھ چکے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے "میں ایک مخفی خزانہ تھا مجھے اس بات سے محبت ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں لہٰذا میں نے خلقت پیدا کر دی ہے"

انسان میں عشق سے بہتر کوئی حالت نہیں جس کو حق سبحانہ سے عشق ہوتا ہے وہ

اپنے آپ سے بھی محبت کرنے لگتا ہے، کسی حسین کو دیکھتا ہے اس سے بھی عشق کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ ایک عارف کا قول ہے اَلْمَجَازُ قَنْطَرَۃُ الْحَقِیْقَۃِ مجاز حقیقت کا پل ہے یعنی مجاز سے حقیقت کی طرف راہ کھلتی ہے۔ بعض صوفیاء کو عورت سے محبت ہوتی ہے کیونکہ وہ عشق حقیقی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ ایک رمز ہے جس کو عاشق ہی خوب جانتے ہیں، کسی عارف نے کہا ہے ؎

میانِ عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

عاشق و معشوق کے مابین ایک رمز ہوتا ہے جس کی کراماً کاتبین کو بھی خبر نہیں ہوتی۔

عشق حقیقی میں ایک قسم کا سوز ہوتا ہے، عاشق کو اللہ سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ اس کا نام پاک لے کر یا سن کر ہی رونے لگتا ہے۔ بعض ایسے عاشق بھی ہوتے ہیں جو اللہ کا نام سن کر تڑپنے لگتے ہیں۔ بیتاب ہوجاتے ہیں۔ اس راز کو شاہ ولی اللہؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "ہمعات" صفحہ ۵۸ و ۵۹ پر لکھتے ہیں:۔

(ترجمہ) بندۂ مومن جس کا اعتقاد یہ ہے کہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ تمام صفات کمالیہ سے موصوف ہیں، اپنے کمال کو انہی کی یاد، یا ذکر پر موقوف رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ حق تعالیٰ کے نام کو یاد کرتا رہتا ہے اور اُن کی نعمتوں کو عنایتوں کو ملاحظہ کرتا رہتا ہے، اس حالت پر مداومت کی وجہ سے اس کے دل میں بیقراری، اضطراب اور قلق و جوش کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ حق تعالیٰ کا نام مبارک زبان پر نہیں لاسکتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح جسم سے پرواز کرجائیگی غرض نفس میں جب یہ کیفیت متمکن ہوجاتی ہے اور روز بروز ترقی

کرتی جاتی ہے اور جوہرِ قلب میں اُتر جاتی ہے اور نفسِ ناطقہ پر اس کا رنگ چڑھ جاتا ہے تو اس کو "نسبتِ عشق" سے تعبیر کرتے ہیں، کاملین اہلِ فنا و بقا کے نزدیک اس نسبت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ اس کا ظاہر تو رُوح میں ایک کیفیتِ مستقرہ ہے دوسری کیفیات نفسانیہ کی طرح، اور اس کا باطن محبتِ ذاتیہ ہے، جس کا حامل نفسِ مجرّدہ ہوتا ہے بلکہ یہ روح کے موجود ہونے سے بیشتر پیدا ہو چکی ہے

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ مٹی اور پانی کا جانبِ اَسفل میلان ہوتا ہے، اسی طرح آگ کو فوق (اوپر) کی طرف طَیران ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کے واسطے خواہ وہ محسوس ہو یا معقول، ایک اصل اور کمال ہوتا ہے، جس کی یہ مشتاق ہوتی ہے اور جب تک اس کو پا نہیں لیتی بیتاب اور بیقرار رہتی ہے اور جب پا لیتی ہے تو اُلفت و اُنس محسوس کرتی ہے، اسی طرح کثرت کو بھی اپنی اصل وحدت کی طرف میلان و طیران ہے اور مظہر کو اپنے ظاہر کے ساتھ ایک خاص ارتباط ہے جو اس کی اصل جبلّت میں مرکوز ہے یہاں نہ کسی خاص حالت یا نعمت کا حصول مقصود ہے اور نہ یہ امر عنایتوں اور نعمتوں کی یاد پر موقوف ہے اس کو "محبت ذاتیہ" کہتے ہیں۔ جب رُوح کی کیفیتِ مستقرہ کا (جس کا اوپر مذکور ہوا) "محبت ذاتیہ" کے ساتھ اتصال ہوتا ہے تو وہ ایک ایسی مرکب حقیقت بن جاتی ہے کہ اس کا جسم تو کیفیت روحانی ہوتی ہے اور اس کی روح "محبت ذاتیہ" ہوتی ہے اور جس شخص میں یہ پائی جاتی ہے وہ اُن دونوں میں

ذاتیہ" ہوتی ہے اور جس شخص میں یہ پائی جاتی ہے وہ اُن دونوں میں

فرق نہیں کر سکتا۔ ہماری اس تحقیق سے صوفیاء کے دو مختلف اقوال میں
تطبیق ہو سکتی ہے، بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ قلق و اضطراب ایک قسم کا
عذاب ہے اور جس کو محبوب کا وصال حاصل ہو وہ اس عذاب میں کیسے
مبتلا ہو سکتا ہے؟۔ اور بعض کا قول ہے کہ عشق اور قلق کسی وقت بھی
سالک سے مرتفع نہیں ہوتا۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ ظاہر ہے کہ گروہ
اوّل کی مراد قلق اور اضطراب روحانی ہے، یعنی وہ کیفیت جو روح میں
مرتسم ہے۔ اور گروہِ ثانی کی مراد "محبت ذاتیہ" ہے۔ لیکن عارفین میں
یہ دونوں کیفیتیں ملی جلی ہوتی ہیں اس لئے تعبیر و تعیین میں مراد، ظاہر
و متحقق نہیں ہو سکتی۔

یہاں دو نکتے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اگر کسی عارف
میں محبت ذاتیہ کمزور ہو جائے تو یہ اس کے حق میں موجب نقصان
ہے۔ گو اس کو تمام اشیاء میں سریان محبوب کا مشاہدہ ہی کیوں نہ حاصل
ہو ———— دوسرا یہ کہ دنیا و آخرت میں تجرید اور اہل و عیال
سے بے فکر ہو جانا، باوجود استقامت اور وفور عقل کے اور بغیر اس
کیفیت ذاتی کے ممکن نہیں"۔ اس نسبت کے حامل کو ماسوی پر تسلط
حاصل ہو جاتا ہے اور اس سے اعراض کرتا ہے، اس لئے جو شخص
بھی اس کو دیکھتا ہے اس کے سامنے فروتنی اختیار کرتا ہے"۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ نے یہ خیال ظاہر فرمایا ہے:-

"لیکن اس مقام میں ایک نہایت باریک نکتہ ہے جس سے
اہلِ زمان غافل اور چوکے ہوئے ہیں، اور وہ نکتہ یہ ہے کہ حبِّ نفسانی

جس کو دوسرے لفظوں میں "لقب عشق" سے نامزد کرتے ہیں اور "حبِّ ایمانی"
جو "حبِّ عقلی" سے مشہور ہے اِن دونوں کے درمیان فرق کیا جائے کیونکہ
پہلی حبّ ساری سلوک کے واردات سے ہے اور دوسری حبّ انبیاء کرامؑ
کے کمالات اور اولیاء عظام کے مقامات میں سے ہے، کیونکہ عوام صوفیا
قسم اوّل کو دوسری کی جگہ رکھ کر اور اسی کو اشاراتِ شرعیہ کا مشارٌ الیہ سمجھ کر
انبیاء اور اولیاء کی سیر کو اہلِ عشق اور وجد کے احوال سے تطبیق دینے میں
ناحق کی دردِ سری اٹھاتے ہیں۔ ("صراط مستقیم" صفحہ ۴)۔۔

مولانا نے دونوں محبتوں پر طویل بحث کی ہے اور خوب سمجھایا ہے۔ ان کے ارشادات کا لب لباب یہ ہے کہ "حبِّ ایمانی اور حبِّ عقلی انبیاء کے کمالات سے ہے" اور "حبِّ نفسانی" "حبِّ عشقی ہے اِس میں حال وجد، بیقراری اور بیتابی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء کو حال نہیں آتی، عالمِ عُلوی کے بڑے بڑے نظارے دیکھ کر بھی خاموش رہتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں۔ منصورؒ کو حبِّ عشقی سے حصّہ ملا تھا اِسی لئے "اَنَا الحق" کا نعرہ لگا بیٹھے۔ اِسی لئے شاہ عبدالحق ردولویؒ نے فرمایا ہے "منصورؒ بچہ بود کہ بیک جرعہ تاب نیاورد" منصور ایک بچہ تھا کہ معرفت کے ایک گھونٹ کی تاب نہ لا سکا"۔

ایک عارف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں خوب شعر کہا ہے ؎

موسیٰؑ زہوش رفت بیک پرتوِ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسّمی

یعنی موسیٰؑ نے صرف تجلّیٔ صفات دیکھی تھی مگر بے ہوش ہوگئے، اور آپؐ کے ظرف اور قوتِ برداشت کا یہ عالم ہے کہ آپ ذاتِ حق کا دیدار کرتے ہیں اور تبسّم فرماتے ہیں "یہی "محبت ذاتیہ" یا "حبِّ ایمانی" یا "حبِّ عقلی" کہلاتی ہے اِس میں اضطراب نہیں ہوتا ہے

جبکہ حُبِ نفسانی اور "حُبِ عشقی" میں اضطراب اور بیتابی ہوتی ہے ۔ وجد طاری ہوتا ہے

جیسا کہ سماع سے ہوتا ہے ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ مشہور صحابی کی ایک مناجات کا شعر ملاحظہ کیجئے ،

حق سبحانہٗ کی طرف سے فرماتے ہیں سہ

اَنَا الْمَوْجُوْدُ فَاطْلُبْنِیْ تَجِدْنِیْ — فَاِنْ تَطْلُبْ سِوَائِیْ لَمْ تَجِدْنِیْ

یعنی میں موجود ہوں جب تو نے مجھے طلب کیا ، پالیا ۔ اگر تو نے میرے سوا کسی اور

کو طلب کیا ، تو مجھے نہیں پائے گا "

ذات پاک حق سبحانہٗ کا خاصہ یہ ہے کہ جب بھی اس کا خیال کرو وہ موجود ہے ۔ اس

کی وجہ یہ ہے کہ ذات حق ہر جگہ موجود ہے ، چونکہ انسان کو غفلت ہو جاتی ہے دنیوی

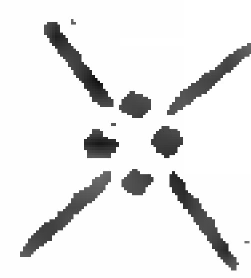
کاموں میں پھنس جاتا ہے اس لئے استحضار نہیں رہتا ۔ مشہور حدیث قدسی (میں اپنے

بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں ۔ الخ) کے معنی بھی یہی ہیں کہ اگر بندہ ذاتِ حق کا تصور کرے

تو اس کو موجود پائے گا ۔ اس کو یافت اور شہود بھی کہتے ہیں یعنی بندہ بہ اعتبار ھُوَ الظَّاھِر

اس کو دیکھے اور بہ اعتبار ھُوَ الْبَاطِنُ اس کو پائے ۔ اس کو صوفیاء کی اصطلاح

میں "دوامِ حضور" کہتے ہیں ۔



عالَمِ مثال!

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

عالمِ مثال جس قدر حقیقت ہے، اتنا ہی حیرت انگیز بھی ہے، اس سے کسی انسان کو گریز نہیں کیونکہ وہ مرتے ہی اُس عالم میں ہوتا ہے۔ غالب کا یہ شعر مشکل اشعار میں گِنا جاتا ہے۔ دراصل یہ شعر حضرت علیؓ کے اس قول کا ترجمہ ہے "دُنیا میں انسان سو رہے ہیں، جب مر جائیں گے تو بیدار ہو جائیں گے!" انسان سوتے ہوئے جب خواب دیکھتا ہے تو اُس کو عالمِ خواب میں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے وہ جو کچھ بھی دیکھتا ہے اس کو حقیقت ہی سمجھتا ہے، جب بیدار ہوتا ہے اس وقت کہتا ہے "میں نے خواب دیکھا تھا" اسی طرح دُنیا میں جو لوگ زندگی گذار رہے ہیں اور کائنات کو دیکھ رہے ہیں یہ گویا ایک خواب ہے، جب مر جائیں گے تب ان کو انتباہ ہو گا کہ ع "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا"۔

مرنے کے بعد انسان جس عالَم میں چلا جاتا ہے اسی کو "عالمِ مثال" یا "عالَمِ برزخ" اور شریعت اسلامی کی زبان میں "عالمِ قبر" کہتے ہیں۔ سب سے پہلے جس ذہین شخص کے دماغ میں عالَمِ مثال کی بات آئی وہ افلاطون (پیدائش سنہ ۴۳۰ء

وفات ۲۶۹ء) ہے۔ اس کا قول ہے کہ اشیاء دنیا میں آنے سے پہلے ایک اور عالم میں موجود ہوتی ہیں، (یہ عالم مثال ہے) اور پھر دنیا میں آتی ہیں۔ دنیا میں آنے سے پہلے جو باتیں وجود پذیر نہیں ہوتیں ان کو "تقدیر" بھی کہتے ہیں (تقدیر پر بحث الگ کی گئی ہے)۔ افلاطون خدا کے وجود کا قائل تھا اسی لئے اس کو "افلاطون الٰہی" کہتے تھے۔ پیدا ہونے سے پہلے انسان جس عالم میں ہوتا ہے اس کو "مثال شرقی" کہتے ہیں، اور مرنے کے بعد جس عالم میں چلا جاتا ہے اس کو "مثال غربی" کہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "حجۃ اللہ البالغہ" میں "باب ذکر عالم مثال" اس طرح شروع کرتے ہیں۔ "اِعْلَمْ اَنَّہٗ اَحَادِیْثُ کَثِیْرَۃٌ عَلٰی اَنَّ فِی الْوُجُوْدِ عَالَماً غَیْرَ عُنْصُرِیٍّ تَتَمَثَّلُ فِیْہِ الْمَعَانِیْ۔۔۔ الخ۔ عربی عبارت طویل ہے ہم صرف اس کا ترجمہ درج کرتے ہیں:۔

"معلوم ہونا چاہیئے کہ بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس عالم عنصری کے علاوہ اور ایسا عالم موجود ہے جس میں معنوی (مخفی) چیزیں (مثلاً صفات انسانی، عبادات، گناہ وغیرہ) اپنی صفت کے مناسب جسم میں ظہور کرتی ہیں اور زمین میں پائے جانے سے پہلے ہر چیز وہاں پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے، پس جب اس دنیا میں پائی جاتی ہے تو ایک طرح سے یہ وہی ہوتی ہے۔ ہم کہہ دیا کرتے ہیں کہ "آسمان سے رحمت نازل ہوئی" یا "مصیبت نازل ہوئی" یہ غلط نہیں کیونکہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ عالم مثال میں ہو کر پھر دنیا میں آتا ہے۔ رسول پاکؐ نے ایک مرتبہ فرمایا "میں آسمان سے فتنے نازل ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں"۔

شاہ ولی اللہؒ صاحب فرماتے ہیں :-

"لوگ آپس میں لڑ رہے تھے ، میں نے دعا کی ، آسمان سے (عالم مثال سے) ایک نقطۂ نور آیا اور لوگوں میں پھیل گیا وہ پھر ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے"

اس سلسلہ میں احادیث تو اس قدر ہیں کہ ہم سب کو اس جگہ نقل بھی نہیں کرسکتے قیامت کے واقعات (قبروں سے اٹھنے کے بعد) سب عالم مثال میں ہونگے مثلاً اللہ کا عرش پر جلوہ افروز ہونا ، قرآن ، حج ، نماز ، روزہ کا مناسب شکلوں میں آنا ، موت کو مینڈھے کی شکل میں ذبح کرنا ، دنیا کا بوڑھی بدشکل عورت کی شکل میں قیامت میں آنا ، قبر میں فرشتوں کا سوال کرنا ، کافر کو ننانوے ۹۹ سانپوں کا کاٹنا ، مومن کو عالم قبر میں جنت نظر آنا ، وغیرہ۔

امام غزالیؒ "کیمیائے سعادت" میں فرماتے ہیں " احمق کہا کرتے ہیں کہ ہم تو قبروں میں دیکھا کرتے ہیں ، وہاں تو ہم کو کوئی سانپ ، آگ یا باغ نظر نہیں آتا۔ اگر یہ چیزیں وہاں ہوتیں تو ہم کو آنکھوں سے نظر آتیں ، ان احمقوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سانپ ، اژدہے یا حور و قصور ، سب روح میں مرتسم ہیں ، خواہ جسم مٹی ہو جائے مگر روح سب کچھ محسوس کر رہی ہے اور دیکھ رہی ہے ۔ جس طرح جاگنے والوں کو وہ چیزیں نظر نہیں آتیں جو سونے والے کو خواب میں دکھائی دے رہی ہیں جب اس کو محسوس ہو رہی ہیں تو اس کے لئے حقیقت ہی ہیں اور موجود ہیں ، جاگتے ہوئے جو کچھ ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ بھی صرف خیال کی کار فرمائی ہے " امام صاحب اپنی کتاب "مضنون" میں فرماتے ہیں " جب روح ، جسم سے الگ ہو جاتی ہے نور روح کے ساتھ قوتِ وہمیہ باقی رہ جاتی ہے ، اس وقت مرنے والے کو

قوت وہمیہ کی وجہ سے عذاب یا لذت مختلف مناسب شکلوں میں محسوس ہوتی رہتی ہے

شاہ ولی اللہؒ صاحب کا تصور یہ ہے کہ روحیں دو ہیں۔ ایک روحِ انسانی یا نفس ناطقہ، دوسری روح ہوائی یا "نسمہ"۔ جب انسان مرتا ہے تو جسم ارضی کے چھوٹ جانے سے اس کے نفس ناطقہ کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ وہ "نسمہ" کے ساتھ جڑا رہتا ہے یا شاہ صاحب کے الفاظ میں "روح انسانی" "نسمہ" پر سوار رہتی ہے۔ اس طرح انسان عالم برزخ یا عالم مثال یا عالم قبر میں متلذذ یا متالم ہوتا رہتا ہے، اسی راز کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا تِرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

یہ سب احساس کی کارفرمائی ہے۔ اور بہ قول برکلے جو چیز محسوس ہوتی ہے وہ حقیقتاً موجود ہوتی ہے۔ جس طرح خواب دیکھنے والا مشاہدہ کرتا ہے اور محسوس بھی کرتا ہے اور دوسرا آدمی خواہ اُس سے لپٹا ہوا ہو کچھ بھی محسوس نہیں کرتا، مگر جس کو محسوس ہو رہا ہے اُس کے لئے یقیناً موجود ہے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عالم مثال میں خیالی صورتیں ایسی نظر آتی ہیں جیسی کہ اہل ریاضت کو نظر آتی ہیں، اگر اُن کے اعمال مَلکیہ ہوتے ہیں تو اُن کو حسین و جمیل صورتوں میں دکھایا جاتا ہے وہ اُن سے نہایت عمدہ طرز سے گفتگو کرتے ہیں اُن کے لئے جنت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے جس میں سے اس کی خوشبوئیں آنے لگتی ہیں۔ اگر اعمال بد کئے ہوتے ہیں تو اُن کو اعمال کی نادرستگی کا علم ایسے بدشکل فرشتوں کی شکل میں نظر آتا ہے جن کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور وہ سخت لہجے میں ہیبت ناک باتیں کرتے ہیں۔ جس طرح غصہ کو درندے کی صورت میں اور بزدلی و نامردی کو خرگوش کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ عالم مثال میں

انسانی رُوحوں کا ایک مَرجع اور مقام خاص ہے جس کی طرف یہ روحیں اس طرح کھنچتی ہیں جیسے مقناطیس کی طرف لوہا کھنچتا ہے۔

خالق نے کمال یہ کیا ہے کہ روح انسانی میں اعمال کی رُوحیں مرتسم ہوجاتی ہیں جو کبھی اس سے نہیں نکلتیں۔ انسان جب سوجاتا ہے تو اعمال کی روحیں ہی مختلف شکلوں میں نظر آتی ہیں، بلکہ انسان جو عمل کرتا رہے گا اس کی روح بیداری میں بھی مختلف حالتوں میں اس کے سامنے آتی ہے یا محسوس ہوتی ہے۔ اگر انسان کو کسی سے حسد ہے تو جلن سارے دن محسوس ہوتی ہے اور مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے مشہور مثل ہے "ازماست کہ برماست" جو کچھ ہمارے سامنے آتا ہے وہ سب ہمارے عمل ہی کا خمیازہ ہے۔ حق سبحانہٗ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ — ہم نے ہر انسان کے عمل کو اس کی گردن میں لٹکادیا ہے۔

یہ عرب کا محاورہ ہے یعنی جیسا کیا ہے ضرور بھرے گا۔ عمل کی روح اس میں سما چکی ہے۔ ایک حدیث ہے کہ خدائے تعالیٰ قیامت میں فرمائے گا "یہ تمہارے ہی اعمال تو ہیں جن کو میں نے تمہارے لئے بیتت کر محفوظ رکھ لیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں "نفس ناطقہ (روح) اعمال کا مبدأ و منبع ہے وہ اسی سے نکل کر اسی کی طرف واپس لوٹ آتے ہیں پھر اسی کے دامن سے چمٹ جاتے ہیں اور بیتت کر اس میں محفوظ کرلئے جاتے ہیں۔ اس موقع پر شاہ صاحب نے اچھے اور بُرے اعمال کے اثرات کی خوب مثال دی ہے انھوں نے کہا ہے کہ ہر درد و رنج اور لذّت و خوشی کی ایک خاص صورت و شکل ہوتی ہے جس میں وہ متشکل ہوکر دکھائی دیتی ہے، مثلاً خلط مُحرِق سے بدن میں خراش اور چبھن ہوتی ہے۔ جس کو صفرا ہے اس کو

خواب میں اکثر آگ اور شعلے دکھائی دیتے ہیں۔ بلغمی مزاج والے کو خواب میں برف پانی وغیرہ دکھائی دیتا ہے۔ جس شخص میں قوتِ ملکیہ کا غلبہ ہوتا ہے اس کو خواب یا بیداری میں انس و سرور کی مختلف صورتیں (جنت، حور و قصور) نظر آتی ہیں۔

عالم مثال کی جو حالت ہے اور اس پر آج کل کے فلاسفر جو اعتراض کر سکتے ہیں امام غزالیؒ نے اس کی ایسی وضاحت کی ہے کہ اس زمانہ میں بھی اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ ان کی یہ عبارت ہم نے "حجۃ اللہ البالغہ" سے نقل کی ہے۔

"احیاء العلوم الدین" میں فرماتے ہیں:۔ اس قسم کی (عالم مثال کے متعلق) احادیث کے ظاہری معنی تو صحیح ہیں لیکن ان کے اسرار اور بھید مخفی ہیں۔ البتہ اہلِ بصیرت پر سب بالکل واضح ہیں، لہذا جن کو ان کے اسرارِ معلوم نہ ہوں اور در اصل حقیقت کا علم نہ ہو تو انھیں ان کے ظاہری معنوں کا انکار نہیں کرنا چاہیئے بلکہ سچا جان کر تسلیم کر لینا چاہیئے کیونکہ یہی ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ ہم نے کافر کی قبر کو بارہا کھول کر دیکھا اور عرصہ تک اس کی لاش کو بھی قبر میں پڑے دیکھا، لیکن یہ چیزیں ہم نے کبھی نہیں دیکھیں تو پھر خلاف مشاہدہ چیز کی کیسے تصدیق کی جائے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی ایسی باتوں کے تصدیق کرنے کے تین حال ہیں:۔

پہلا حال جو سب سے زیادہ واضح، صحیح اور قابل تسلیم ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب باتیں اپنی جگہ موجود ہیں، بیشک اس کو سانپ اور اژدہا ڈس رہا ہے لیکن تجھ کو ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا کیونکہ ملکوتی امور کے دیکھنے کی ان آنکھوں میں صلاحیت ہی نہیں

اور جو چیز بھی آخرت سے تعلق رکھتی ہے وہ ملکوتی ہے۔ دیکھئے صحابہ رضؓ
نزولِ جبرئیلؑ پر کس طرح سے ایمان رکھتے تھے حالانکہ وہ ان کو دیکھتے
نہ تھے اور ان کا اس بات پر بھی ایمان تھا کہ آنحضرتؐ جبرئیلؑ کو دیکھا
کرتے ہیں، پس اگر تم کو اس بات پر ایمان نہیں تو تمہارا ملائکہ اور
وحی پر بھی صحیح طور پر ایمان لانا بڑا مشکل ہے (لہذا پہلے اس کی تجدید
و تصحیح ضروری ہے) اور اگر تم کو ایمان ہے اور تمہارے نزدیک ممکن ہے
کہ ایک چیز اُمّت کو نظر نہ آئے لیکن آنحضرتؐ کو دکھائی دے تو پھر
میّت کی بابت اس کے تسلیم کرنے میں تم کو کیوں تردّد ہے اور جس
طرح فرشتے، آدمی اور حیوانات کے مشابہ نہیں اسی طرح وہ سانپ،
اور بچھو جو میّت کو ڈستے ہیں ہمارے عالمِ عنصری کے سانپ اور
بچھوؤں کی طرح نہیں بلکہ وہ کسی اور جنس کے ہیں اور کسی اور قسم کی
قوتِ حس سے ادراک میں آسکتے ہیں۔

دوسرا حال یہ ہے کہ سونے والے کی حالت تو تم کو یاد ہوگی کہ وہ
خواب میں سانپ کو ڈستے دیکھتا ہے اور اس کی تکلیف اور ایذا بھی
اس کو محسوس ہوتی ہے جس طرح جاگتے کو محسوس ہوتی ہے یہانتک
کہ تم اس کو چیختے ہوئے اور پسینہ ماتھے پر آتے ہوئے دیکھتے ہو
اور کبھی وہ اپنی جگہ سے اچھل بھی پڑتا ہے یہ سب باتیں وہی دیکھتا اور
محسوس کرتا ہے لیکن ظاہر میں تم اس کو وہیں پڑا دیکھتے ہو، نہ اس
کے گرد سانپ دکھائی دیتے ہیں نہ بچھو، حالانکہ اس کے لحاظ سے سانپ
بھی اس کے پاس موجود ہیں اور بچھو بھی اور تکلیف بھی اُسے برابر

محسوس ہو رہی ہے لیکن یہ سب باتیں تمہارے لحاظ سے مشاہدہ سے
باہر ہیں اور جب سزا اور عذاب دراصل ڈسنے کی تکلیف سے ہوتا ہے
تو پھر خیالی سانپ ہونے یا حقیقی سانپ ہونے سے اس میں کیا فرق پڑتا ہے
تیسرا حال یہ ہے کہ تم خوب جانتے ہو کہ سانپ بذات خود کچھ
تکلیف وضرر نہیں دیتا بلکہ جس چیز سے تم کو درد و تکلیف پہونچتی ہے وہ
اس کا زہر ہے، پھر زہر بھی بذات خود کچھ باعث تکلیف نہیں بلکہ اس
سے جو اثر حاصل ہوتا ہے وہ اصل وہی (باعث) تکلیف ہے۔ تو اگر سوائے
زہر کے چاہے کسی اور چیز سے یہ اثر حاصل ہو تو وہ بھی ایک قسم کی تکلیف وعذاب
ہو گا جو اس سے کسی طرح کم نہ ہو گا۔ لیکن اس عذاب کی تکلیف کو بغیر
ایسے سبب کی طرف نسبت دیئے بیان نہ کر سکو گے جس سے عام طور پر
اسی قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ جیسے جماع کی لذت، اگر انسان کو بغیر
عورت سے صحبت کئے حاصل ہو جائے تو وہ اس کی تعریف مباشرت کی طرف
نسبت دیئے بغیر نہیں کر سکتا، اور یہ نسبت محض سبب (کے اثر) کی تعریف
کے لئے کرتے ہیں اور اس لئے کہ سبب کا ثمرہ حاصل و معلوم ہو جائے، گو
سبب کی صورت حاصل نہ ہو۔ اور سبب بیان کرنے سے اس کا ثمرہ
بتانا مقصود ہوتا ہے، اور بذات خود بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا۔"

یاد رہے کہ امام غزالیؒ بہت بڑے فلاسفر بھی تھے اور مسلّم صوفی بھی، عالم مثال یا
عالم برزخ کے جو تین احوال بیان کئے ہیں وہ مخالف کو جواب دینے کے لئے ہیں ورنہ
حق وہی ہے جو اول بیان کیا گیا ہے یعنی سب چیزیں ملکوتی ہیں، اس عالم
عنصری میں، عنصری آنکھوں سے نظر نہیں آسکتیں۔ مرنے کے بعد انسان جس

عالم میں پہونچتا ہے وہ ملکوتی ہے اور وہاں نگاہ بھی ملکوتی ملتی ہے تاہم
امام غزالیؒ نے اتنی عمدہ وضاحت کردی ہے کہ جس سے بہتر ممکن نہیں۔

تنزیہ و تشبیہ

اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا

حق سبحانہٗ اپنی ذات میں بے مثل ہیں۔ مرتبۂ احدیت میں ان کی ذات پاک کا احاطہ کبھی نہیں ہو سکتا، خواہ جنت ہی کیوں نہ ہو، مرتبۂ تنزیہہ میں ان کی ذات پاک اتنی مُنزّہ ہے کہ ذہن اس کو گھیر نہیں سکتا۔ چونکہ انسان مرتبۂ تنزیہہ میں اس کا ادراک نہیں کر سکتا اس لئے حق سبحانہٗ نے اپنے کرم سے مرتبۂ تشبیہہ میں ظاہر ہونے کی عادت کی ہے۔ متعدد آیات قرآنی و احادیث تشبیہہ کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہم چونکہ "ظاہر و باطن" کے عنوان سے اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈال چکے ہیں، لہٰذا دوسرے پہلو سے اس پر مختصر بحث کرتے ہیں۔

ذات پاک ظہور کو چاہتی ہے، کیونکہ اگر وہ ہمیشہ ہی مرتبۂ تنزیہہ میں رہے تو انسان کا دماغ اس کے ماننے بلکہ جاننے سے انکار کر سکتا ہے، چونکہ ان کا صفاتی نام "باطن" بھی ہے اور "ظاہر" بھی، لہٰذا انسان کی استعداد کے لحاظ سے وہ تنزیہہ اور تشبیہہ کے جامع ہیں، یعنی مُنزّہ ہیں عین تشبیہہ میں اور مُشبّہ ہیں عین تنزیہہ میں۔"

"اشعریہ" فلسفیوں کا ایک گروہ ہے، وہ حق تعالیٰ کو اس قدر مُنزّہ مانتا

ہے کہ تشبیہہ کا قائل نہیں۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ قیامت میں اور جنت میں حق سبحانہ کا دیدار نہیں ہوگا کیونکہ وہ عام انسانوں اور دیگر اشیاء کی طرح نظر نہیں آسکتے۔ ان کی نظروں سے تشبیہہ کی آیات واحادیث اوجھل ہو گئی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں میں ایک فرقہ "مشبّہ" پیدا ہوا ہے جو اللہ سبحانہ کی شکل وصورت بلکہ جسم کا بھی قائل ہے۔" ایک حدیث ہے کہ "جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو اللہ تعالےٰ پہلے آسمان پر آجاتا ہے۔ الخ"۔ مُشبّہ کہتے ہیں کہ خداوند کریم بذات خود آتے ہیں۔ اہل سنّت کہتے ہیں کہ "توجّہ اور رحمت کا نزول مراد ہے" غرض اختلاف کی وجہ محض یہ ہے کہ ایک فرقہ کی نظر سے دوسری آیات واحادیث پوشیدہ ہو گئی ہیں اور یہی انکار کا سبب بنتا ہے۔

اب غالبؔ کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ مرتبۂ احدیت میں حق سبحٰنہٗ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، اس مرتبہ میں دوئی نہیں ھُوَ الظَّاھِرُ کا اقرار بغیر ھُوَ الْبَاطِنُ کے اقرار کے نامکمل ہے۔ شیخ محی الدین ابن العربیؒ نے خوب فرمایا ہے :۔

"اگر تو تنزیہہ محض کا قائل ہوگا تو حق سبحانہ کی ذات "غیب" میں مقیّد ہو جائے گی اور ھُوَ الظَّاھِرُ کا انکار لازم آئیگا اور اگر تو صرف تشبیہہ کا قائل ہوگا تو حق تعالیٰ کو محدود کرنے والوں میں سے ہوگا۔ لیکن اگر تو دونوں امر کا قائل ہو اور حق تعالیٰ کو مُنزّہ عین تشبیہہ میں اور مشبّہ عین تنزیہہ میں جانتا تو راہ راست کا چلنے والا اور معارف الہٰیّہ کا امام اور سردار ہوگا۔ (قرآن اور تصوف صفحہ ۸۷)

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ حق تعالیٰ کے کسی صورت میں ظاہر ہونے

سے ان کی ذات پاک متاثر نہیں ہوتی، وہ جیسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ خواب میں حق سبحانہ کو دیکھنا جائز ہے، اکثر انبیاء اور اولیاء نے دیکھا ہے مگر کسی تشبیہی شکل میں ہی دیکھا ہے۔ حضرت موسیٰ کو درخت پر جو تجلّی نظر آئی وہ تشبیہی تھی۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ مومنین کو تشبیہی شکل میں دیدار دکھائیں گے۔ یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اگرچہ حق سبحانہ کا کوئی مثل نہیں لیکن مثال ہے۔ قیامت میں حق سبحانہ عرش پر تجلّی فرمائیں گے ایک طرف جنّت ہوگی دوسری طرف دوزخ۔ یہ تجلّی تشبیہی ہوگی/ اس کا کچھ اشارہ "عالمِ مثال" کے عنوان کے تحت دیا گیا ہے اس کو بھی دیکھئے۔

صوفیاء کے نزدیک تخلیق تجلّی ہے، تمثّل ہے، ظہور ہے۔ خدائے قدوس مرتبۂ ذات میں منزّہ ہیں، مرتبۂ صفات میں مُشبہ ہیں۔ جب بھی ظاہر ہوتے ہیں صفات کے پردے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدّث دہلویؒ فرماتے ہیں "ذات را، جز پردۂ ذات نہ تواں دید"۔ ذات کو ذات کے پردے یعنی صفات میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ طور پر حق سبحانہ کی تجلّی "نور" کی صورت میں ہوئی تھی اور درخت میں "نار" کی شکل میں/

تجلّی کے معنی یہ ہیں "ذات پاک کا جیسے کے ویسے رہتے ہوئے صورتِ تشبیہی سے ظہور کرنا"۔ ذات خداوندی تنزیہہ میں نظر نہیں آسکتی۔ یہاں اس کی یکتائی کا ظہور ہے۔ اور مرتبۂ تشبیہہ میں کسی مناسب صورت میں ہی جلوہ نما ہوسکتی ہے منصورؒ نے "اَنَا الحَق" کا نعرہ یہ احساس کرکے لگایا کہ "پردۂ صفات میں اسی کا ظہور ہے یہاں تک کہ خود میں بھی"۔۔۔ انسان بہ یک وقت ایک

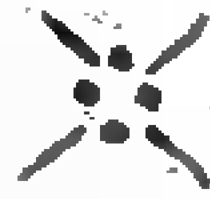
ہی بات سوچ سکتا ہے۔ دوسرے اعتبارات اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں جب مشاہدہ قوی ہو جاتا ہے تو سالک ہر شئے میں اسی کو دیکھتا ہے لہذا "ہمہ اوست" باعتبار مشاہدۂ سالک کے درست ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے نہیں۔

ذات پاک اور اشیاء میں کُلّی طور پر غیریت ہے جیسا کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں۔ ایک مشہور حدیث ہے کہ حق سبحانہ سب مومنین پر عام تجلی کریں گے اور ابوبکرؓ کے لئے خاص تجلی ہو گی۔" امام غزالیؒ نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو تجلی ان کی استعداد کے مطابق ہو گی۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ خدائے تعالیٰ ان کے لئے الگ دیدار دکھائیں گے۔ اس کی تفصیل "احیاء العلوم" میں ہے۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہؐ نے حق سبحانہ کو مثالی صورت میں دیکھا تھا۔ امام ابوحنیفہؓ نے سو مرتبہ حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ یہ مثالی یا تشبیہی شکل ہی میں دیکھا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اللہ تعالیٰ کو تشبیہی شکل میں خواب میں دیکھا۔ دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک کونسی عبادت افضل ہے؟ ارشاد ہوا "قرآن"۔ شریعت میں اللہ تعالیٰ کا تشبیہی شکل میں تجلی فرمانا ثابت ہے۔ اس طور پر تجلی فرمانے سے ذات پاک کے غنی ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا حضرت جبرئیلؑ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دحیۂ کلبیؓ (ایک صحابی) کی شکل میں آیا کرتے تھے۔ مگر اس ظہور سے حقیقتِ جبرئیلؑ میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا حضرت عزرائیلؑ ایک ہی وقت میں ہزاروں آدمیوں کی روحیں قبض کرتے ہیں اور مختلف شکلوں میں (انسانوں کی استعداد باطنی کے لحاظ سے) ظہور فرماتے ہیں، مگر حقیقتِ عزرائیلی جیسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔

حق سبحانہ کا نام ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ یہ صفاتی نام ہے۔ ظہور کے لئے

تشبیہی شکل ہونا ضروری ہے۔ باطن میں اِستتار لازمی ہے۔ حاملین عرش حق سبحانہٗ سے بہت قریب ہیں مگر ذات مُنزّہ سے اس قدر قریب نہیں کہ دیکھ سکیں۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے وہ بھی ایسا ہی ایمان بالغیب رکھتے ہیں جیساکہ عام مومنین۔ معراج میں رسول اللہؐ حق تعالیٰ سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ لوگوں کا گمان یہ ہو گیا تھا کہ آپؐ نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "یارسول اللہ کیا آپ نے معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا؟" آپؐ نے جواب دیا "نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ" (وہ نور ہے میں اُس کو کیسے دیکھ سکتا تھا) یہ مقامِ اَحدیت ہے، یہاں کوئی نزول نہیں۔ یہ ہویّت کا مرتبہ ہے یعنی تنزیہ کا، اس مرتبہ میں کوئی بھی حق سبحانہٗ کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس مرتبہ میں وہ اس قدر لطیف ہے کہ اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ قرآن میں ہے کہ اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں بلکہ وہ نگاہوں کو دیکھ لیتا ہے۔ غالب نے اسی تصور کو پیش کیا ہے۔

شعر
اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دُوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا





خیر و شرّ

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

دُنیا میں بُرائی بھی ہے بھلائی بھی، نور بھی ہے ظلمت بھی، کفر بھی ہے، ایمان بھی، شرارِ بولہبی بھی ہے نورِ مصطفوی بھی۔ جن مستشرقین نے اسلام کا گہری نظر سے مطالعہ نہیں کیا وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں شر ہی شر ہے۔ بلکہ شر اس قدر ہے کہ خدا اور انسان کی سالہاسال کی کوششیں بھی دُنیا سے شر کا خاتمہ نہیں کر سکیں۔ ان فلاسفروں میں اسپنوزا، امّل، جارج برنارڈ شا، ولیم جیمس، شِلر، اور نکلسن زیادہ مشہور ہیں۔ یہ فلاسفر حیران ہو کر سوال کرتے ہیں کہ جب خدا قادرِ مطلق ہے تو شر کو کیوں دُور نہیں کرتا جو نہ اُس کے نزدیک پسندیدہ ہے نہ انسان کے نزدیک۔ اور جب خیر سے خیر ہی صادر ہوتا ہے تو شر دُنیا میں کس طرح پیدا ہو گیا؟۔ زیادہ شُبہ اسلام کے اس عقیدے سے بھی ہُوا کہ اللہ" خالق خیر و شرّ ہے حالانکہ یہ عقیدہ حق ہے۔

صوفیاء کی نظر گہرائی تک پہونچتی ہے۔ غالبؔ کا مذکورہ بالا شعر صاف شہادت دے رہا ہے کہ غالبؔ کو تصوّف کا کچھ حصّہ ملا ہے۔ دُنیا میں لطافت بے کثافت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ جس طرح آئینہ کے پیچھے زنگ ہونے سے آئینہ کا ایک رُخ اتنا

شفاف ہوجاتا ہے کہ اُس میں صورت نظر آنے لگتی ہے اسی طرح چمن گویا بادِ بہاری کا زنگ ہے جس سے بادِ بہاری محسوس ہوتی ہے۔ جب مغرب کے فلاسفروں نے دیکھا کہ "شر" دُنیا سے دور نہیں ہوسکتا تو وہ قنوطیت پرست بن گئے۔ ان کا عقیدہ یہ ہوگیا کہ دُنیا میں بُرائی، غم اور شر کے سوا کچھ نہیں۔ اور پھر خدا کی قدرت پر بھی شبہ کیا کہ وہ شر کو ناپسند کرنے کے باوجود دور نہیں کرسکتا۔

صوفیائے کرام نے اس راز کی گہرائی کو سمجھا ہے اور خوب سمجھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ذات حق سبحانہ' سراسر وجود ہے اس کے علاوہ اور اشیاء میں عدمیت ہے، اللہ کا علم قدیم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے، ہر شئے ازل سے علم الٰہی میں ثابت ہے۔ ان معلومات حق کو صوفیاء "اعیان ثابتہ" کہتے ہیں۔ ان کو "اعدام" اور "معدومات حق" بھی کہتے ہیں۔ ساری صفات ذواتِ خلق سے مسلوب ہیں۔ یوں سمجھو کہ تمام چیزوں کی حقیقت عدم ہے اور عدم شر ہے، خداوند کریم کی ذات وجود ہے، وہ سراسر خیر ہے۔ وجودِ مطلق جب اپنا پرتوَ اعدام پر ڈالتا ہے تو کہیں کچھ کسر رہ جاتی ہے (یعنی اس کے ارادے سے، بلا ارادہ نہیں) جتنا حصہ وجود کا ملا وہاں خیر رہا اور جہاں پرتو نہیں پڑا وہ حصہ "شر" کا رہ گیا۔ مثلاً ایک انسان زیادہ سخی ہے دوسرا اس سے کم، تیسرا اس سے کم تر سخاوت خیر ہے۔ انسان کی رُوح میں جتنا حصہ وجود کا آیا وہاں سخاوت ہے اور جو تشنہ رہ گیا وہ بُخل ہے، بُخل ہی شر ہے۔ بُخل، وغیرہ صفات، "صفات عدمیہ" کہلاتی ہیں۔ صفاتِ وُجودیہ (خیر) کا نہ ہونا، گویا صفاتِ عدمیہ کا پایا جانا ہے یعنی وہاں شر کی صفات پائی جائیں گی۔

اور زیادہ وضاحت کے ساتھ پھر سمجھ لیجئے۔ آفتاب کی روشنی سے نور پیدا ہوتا ہے، درخت یا کسی بلڈنگ کے حائل ہونے سے سایہ یا ظلمت پیدا ہوتی ہے۔

آفتاب کا کام نور ڈالنا ہے۔ جہاں نور نظر آرہا ہے وہاں وجود یا خیر ہے، جہاں اندھیرا یا سایہ نظر آرہا ہے وہاں عدم یا شر ہے۔ دیکھئے آفتاب کے وجود سے نور و ظلمت دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ وجود باری کے پرتو سے (جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے) خیر اور شر دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے اسلام حق سبحانہ کو خالقِ خیر و شر کہتا ہے۔ کیونکہ اسی کے ارادے اور قدرتِ کاملہ یا حکمتِ بالغہ سے خیر و شر پیدا ہوئے ہیں۔ اب آپ قرآن کی اس آیت کا مطلب سمجھ جائیں گے کہ "تجھ کو جو بھلائی (خیر) پہونچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے (فَمِنَ اللّٰہِ) اور جو برائی (شر) پہونچتی ہے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے (فَمِن نَّفۡسِكَ)

اسی لئے مولانا جامیؒ فرماتے ہیں ؎

ہر شر ز عدم بود، و عدم غیر وجود   پس شر ہمہ مقتضائے غیر است اے دل

ہر شر عدم ہے اور عدم غیر وجود ہے، لہذا شر، غیر کا مقتضا ہے وجود مطلق کا نہیں۔ شر عدم کا مقتضا ہے جو خداوند سبحانہ کا غیر ہے۔ لہذا جہاں خیر ہے وہ سب وجود حق سبحانہ کا فیض ہے اگرچہ دونوں کا وجود ان کی حکمت کا نتیجہ ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مغربی فلاسفروں کا یہ کہنا کس قدر حماقت ہے کہ خدا شر دور کرنے پر قادر نہیں۔ آپ زیادہ غور کریں گے تو یہ اذعان و یقین حاصل ہو جائے گا کہ خیر کے ساتھ شر ضروری ہے۔ خوب کہا ہے کسی نے ؎

در کارخانۂ عقل، از کفر ناگزیر ست   دوزخ کرا بسوزد، اگر بولہب نباشد؟

قُربِ وَمعیّت

برآورد بے کلفتِ سمت و سُو
بہ نورُ السمٰوات والارض رُو

مرزا غالب نے قرآن کے فقرے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے معنی ہیں "اللہ زمین و آسمان کا نور ہے" بہت فصیح و بلیغ فقرہ ہے۔ یوں نہیں فرمایا کہ اس کے نور سے نظر آرہے ہیں" نہ یوں فرمایا "کہ خدا کے نور سے پیدا ہوئے ہیں" نہ یہ اشارہ کیا "کہ آسمانوں اور زمین اور ساری کائنات سے خالق کا نور ظاہر ہے" اس آیت کے معنی یہ ہیں" اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے" قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا ہے وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو)۔ قرآن کی اس آیت کی تاویل علماء نے ظاہر کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے" اس سے علمی قرب مُراد ہے ذاتی نہیں" اگر ہم اس کو مان بھی لیں تب بھی قربِ ذاتی ہی مُراد ہوگا۔ کیونکہ علم خدا کی صفت ہے، جہاں صفت ہوگی وہاں ذات کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ذات کہیں اور ہے اور صفت کسی اور جگہ ہے

"قرب و معیّت" صوفیاء کی ایجاد نہیں۔ قرآن و احادیث میں متعدد مقامات پر یہ وضاحت کی گئی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے "فتح الرحمٰن" میں "وَھُوَ مَعَکُمْ" کے معنی یہ بیان کیے ہیں "او با شماست ہر جا کہ باشید" یعنی وہ

تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ شاہ صاحبؒ نے "قول الجمیل" میں کہا ہے اَللّٰہُ مَعِیْ (اللہ میرے ساتھ ہے) کا مراقبہ کرو۔ اللہ کی نسبت ساتھ ہونے کو خوب مضبوط تصور کرو۔ باوجود پاک ہونے اس ذات مقدس کے جہت و مکان سے (قول الجمیل)۔ حق سبحانہٗ ہر جگہ موجود ہیں۔ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا الخ یعنی تم اپنا منہ جدھر پھیرو وہیں ہے ذات اللہ کی "شاہ عبدالعزیزؒ اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں "ہر جا ایستادہ روئے خود را بسوئے او گردانید و باو متوجہ شوید، پس در ہموں مکان لست حضور خدا و قرب او" یعنی تم جس جگہ بھی کھڑے ہو کر اپنا منہ اس ذات پاک کی طرف کرو اور اس کی طرف متوجہ ہو پس اسی جگہ ذاتِ خداوندی اور اس کا قرب ہے، ذاتِ باری کے سوا اور کسی کی ہستی ایسی نہیں ہے کہ وہ اپنے یاد کرنے والے کی طرف توجہ کرے، خواہ اندھیرا ہو خواہ روشنی۔ خواہ جنگل ہو خواہ شہر، بندے نے توجہ کی اور وہ حاضر۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ ط بیشک اللہ ہر چیز کے ساتھ موجود ہے۔ شہید کے لغوی معنی اس ذات کے ہیں جو حاضر ہے اور کوئی شے اس سے غائب نہ ہو سکے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ حضوری ذات کی نہیں بلکہ علم کی ہے، لیکن صوفیاء کہتے ہیں کہ جہاں صفت ہو گی وہاں ذات بھی ہو گی کیونکہ صفت کا ذات سے انفکاک محال ہے۔ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا "ہمارا رب قریب ہے کہ اس سے آہستہ آہستہ باتیں کریں، یا دور ہے کہ اس کو زور سے پکاریں؟" عرب کتنے سیدھے تھے لیکن خدائے حکیم کی حکمت ملاحظہ فرمائیے کہ ان کے سادہ سوالات کے جوابات بہت فلسفیانہ اور محققانہ ملتے تھے حضورؐ نے جواب نہ دیا، خاموش رہے اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب

ہوں کہ اس سے واضح طور پر بندہ کے ساتھ حق سبحانہٗ کی معیت ثابت ہوتی ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے، آپ ﷺ نے فرمایا آہستہ کہو، تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو، تم اُس سُننے اور دیکھنے والے کو پکار رہے ہو جو تمہارے ساتھ ہے اور جس کو تم پکار رہے ہو وہ تمہارے اونٹ کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اسی حدیث سے نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا ذکر آہستہ ہی افضل ہے۔

خواجہ باقی باللہؒ فرماتے ہیں کہ بندہ کو حق سے دوری ہی نہیں۔ "رسالہ نور وحدت" میں لکھتے ہیں "چوں دانستی کہ حقیقت این است معلوم تو شد کہ قُرب و بُعد مسافت ہمہ از توہّم است کے دُوری بود تا نزدیکی حاصل شود، کے جُدائی داشت تا پیوستگی کند"۔ یعنی جب تجھے معلوم ہو گیا کہ حقیقت یہ ہے، فاصلہ کا قریب یا بعید ہونا محض وہم ہے دُوری تھی ہی کب کہ اب نزدیکی حاصل ہو، جُدائی کب تھی کہ اب قرب حاصل ہو"۔ حضرت رومیؒ نے خوب کہا ہے

؎ اتصالے بے تکیّف بے قیاس   ہست ربّ النّاس را با جانِ ناس

یعنی حق سبحانہٗ کو انسانوں کی روح سے ایسا قُرب ہے کہ جس کی نہ کیفیت بیان کی جا سکتی ہے نہ خیال میں آ سکتا ہے۔ دراصل یہ قُرب وجدانِ سلیم سے حاصل ہوتا ہے۔ حق کی ذات پاک بیچون و بیچگون ہے، ایسے ہی ان کا نور السمٰوٰت والارض ہونا بھی بیچون و بیچگوں ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ وحدت الوجود کے قائل نہیں تاہم اُن کے قلم سے بیساختہ یہ الفاظ نکل گئے ہیں "اُو سبحانہٗ تعالیٰ از ہر نزدیکی، نزدیک تر است حتّیٰ ذات احدیت او را سبحانہٗ نزدیک ترمی یا بیم از صفاتیکہ ما افعال و آثار آں صفاتیم"۔ یعنی اللہ بندہ سے سب نزدیکوں سے زیادہ نزدیک ہے یہاں تک کہ ذات احدیت اُن صفات سے بھی زیادہ نزدیک ہے کہ جن کے افعال و آثار سے ہمارا وجود ہوا ہے۔

محبّت اور خلوص

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

حق سبحانہٗ اتنے فیاض ہیں کہ دونوں جہان بھی کسی خوش نصیب کو دے سکتے ہیں، لیکن جو صرف ان ہی کو چاہتے ہیں وہ دونوں جہان پر راضی نہیں ہو سکتے! خسروؒ نے بھی اسی خیال کو ظاہر کیا ہے ؎

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

دراصل اس کائنات کی تخلیق محبت کی بنا پر ہوئی ہے۔ اُن کو اپنی ذات سے محبت ہے، لہٰذا اپنے نقش سے بھی محبت ہوئی۔ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ "اللہ" "ولاہٌ" سے نکلا ہے اس کے لغوی معنی اُس محبت کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسی سے اردو میں والہ و شیدا مستعمل ہے۔ اللہ کے معنی ہیں وہ محبوب جس کے عشق میں انسان و حیوان بلکہ زمین و آسمان سرگرداں ہیں۔ غالب نے خوب کہا ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

شیخ محی الدین ابن العربیؒ "فتوحات مکیہ" میں لکھتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اس نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور

انسان مجموعۂ عالم ہے اور اللہ تعالیٰ کو عالم کا جو علم ہے وہ اپنی ذات
ہی کا تو علم ہے کیونکہ وجود اسی کے، اور اس کے فعل کے سوا کسی کا
نہیں پس ضروری ہے کہ آدم اس کی صورت پر ہو، پس جب
اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلّی عین پر کی، تو عین اس کا مُجلّیٰ یا تجلّی گاہ بن گیا، پس
عالم جمالُ اللہ ہے اور اللہ اپنے ہی جمال کا مُحِب ہے، اب جو عالم
کو اس نظر سے محبوب رکھتا ہے۔ وہ جمالِ حق اور اس کی صورتِ جمال
ہی کو محبوب رکھتا ہے۔" //

اللہ سے محبت کی وجہ سے عبادت کرنی چاہیئے نہ کہ جنّت کی طلب اور دوزخ کے
ڈر سے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذاتِ پاک خود ہی محبت کی متقاضی ہے، خود ذات
پاک، مومن کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مقرّبین کے دو درجے ہیں" سالک اور محبوب"
سالک وہ ہے جو محبوبِ حقیقی تک پہونچنے کے خود جدّوجہد کرے اور کوشش کے
بعد دربار تک پہونچے اور محبوب وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنی طرف کھینچے اور محبوب
بنائے۔ قرآن پاک میں اس کی دلیل موجود ہے "اَللّٰهُ یَجْتَبِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ
وَیَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اُس کو چُن کر
محبوب بنا لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔"

اللہ سے محبت کیوں کی جائے؟ اس کے بہت سے جواب ہیں۔ اوّل یہ کہ انسان
کا وجود اس کے وجود کا پرتو ہے، اگر اس کی نظرِ عنایت نہ ہوتی تو اُس کا وجود ہی نہ ہوتا
قرآن میں کسی مومن کا قول اللہ سبحانہٗ نے نقل کیا ہے۔" وَمَالِیَ لَآ اَعْبُدُ... الخ
" مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔"
یعنی پیدا کرنا ہی ہزار نعمت ہے اگر ابد تک اس کی عبادت کی جائے تب بھی حق ادا

نہیں ہوتا۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں " محبت تمام مقامات کی انتہائی غایت ہے "
شاہ عبدالحق محدّث دہلویؒ فرماتے ہیں " محبت حیات قلوب و غذائے ارواحِ اہل ایمان است "۔ یعنی محبت ایمان والوں کی رُوحوں کی غذا اور دلوں کی زندگی ہے "
قرآن میں ہے یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ " اللہ مومن بندوں سے محبت رکھتا ہے اور وہ اُس سے محبت رکھتے ہیں "۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ فرماتے ہیں " اگر بہشت را خواہند برائے آں خواہند کہ محل رضائے اوست تعالیٰ و تقدس و رطلب آں مرضیٔ اوست عزّ سلطانہٗ واز دوزخ پناہ جویند کہ محل سخط مولیٰ است تعالیٰ الخ۔ یعنی صوفیاء یا مخلص بندے اگر بہشت کی طلب کرتے ہیں تو محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ حق سبحانہٗ کی رضا کی جگہ ہے اور دوزخ سے اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ وہ حق سبحانہٗ کے غضب کی جگہ ہے "۔

شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ فرماتے ہیں " رحمتِ خداوندی کی دو۲ قسمیں ہیں عام پیدا کرنا ہے، اور خاص علم و اخلاق میں بعض بندوں کو مخصوص کرنا ہے۔ یہ دونوں عنایتیں وَہبی ہیں یعنی بغیر طلب ملی ہیں۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام " وَھَّاب " بھی ہے۔ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن کو علم و اخلاق ملے ہیں۔

امام غزالیؒ کا قول ہے " اچھا عمل انسان تین وجوہات سے کرتا ہے۔ (۱) دوزخ کے ڈر سے۔ (۲) جنّت کی طلب میں۔ (۳) صرف حق سبحانہٗ کی محبت سے "۔
دوزخ کے ڈر سے جو آدمی عبادت کرتا ہے اس کی مثال اس غلام کی سی ہے جو اپنے آقا کی خدمت اس خوف سے کرتا ہے کہ کہیں وہ سزا نہ دے؛ جو بندہ جنّت کے لالچ میں عبادت کرتا ہے اس کی مثال اس نوکر کی سی ہے جو اپنے آقا کی خدمت انعام و اکرام حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے، اگرچہ یہ دونوں باتیں بھی

بُری نہیں بلکہ محمود ہیں۔ لیکن سب سے بہتر وہ غلام ہے جو اپنے آقا کی خدمت صرف اُس کی محبّت اور رضا کی وجہ سے کرتا ہے شیخ سعدیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

منّت مَنِہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کُنی　　منّت شناس ازو کہ بخدمت گذاشتت

یعنی تو یہ احسان نہ رکھ کہ بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے بلکہ بادشاہ ہی کا احسان سمجھ کہ تجھ کو اپنی خدمت کے لئے مقرر کیا ہے" ورنہ کروڑوں انسان ایسے ہیں جن کو اپنے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتا۔ اقبالؒ نے اسی نکتہ کو اپنے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے ؎

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں　　عشق پر اعمال کی بُنیاد رکھ

حضرت مجدّد الف ثانیؒ فرماتے ہیں" شکرِ مُنعِم بر مُنعَم علیہ واجب است عقلاً وشرعاً" یعنی بندہ پر منعم حقیقی کا شکر ادا کرنا واجب ہے عقلاً بھی اور شرعاً بھی۔ دراصل بندہ کی رُوح کو حق سبحانہٗ کی طرف ایک کشش ہے جیسے لوہے کو مقناطیس کی طرف۔ دل یا رُوح میں ایک کشش سی محسوس ہوتی ہے، بندہ کی آنکھوں میں خالق کی محبت کی وجہ سے آنسو آجاتے ہیں، اُس کے روکنے پر انسان کو قدرت نہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکرِ الٰہی، صلہ رحمی، جہاد، علم سیکھنا، سکھانا سب کا مقصد محبت پیدا کرنا ہے، ان اعمال کے چھوڑنے سے ایمان بھی کمزور ہوتا ہے اور محبت میں بھی کمی ہوتی ہے تجربہ کاروں کو وجدان سے معلوم ہو جاتا ہے اور وجدانِ سلیم معرفت وعبادت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

۷ غالبؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ دونوں جہان مجھ کو دے کر یہ سمجھے کہ یہ اب خوش ہو گیا، مگر میں شرم سے چپ ہو گیا، فیّاضِ مطلق سے تو میں اُن کو ہی چاہتا تھا۔

سماع

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

سماع کے معنی ہیں گانا سُننا، قدرت کاملہ نے گانے میں ایک اثر رکھا ہے اس سے کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا۔ سماع کے متعلق دو گروہ ہو گئے ہیں "ایک اس کو جائز کہتا ہے دوسرا ناجائز" صوفیاء میں نقشبندیہ و قادریہ سماع کو جائز نہیں سمجھتے۔ چشتیہ صابریہ کے یہاں سماع جائز ہے۔ امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" اور "کیمیائے سعادت" میں سماع کا الگ باب لکھا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر خوب بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "گانا اس لئے حرام نہیں کہ وہ اچھا لگتا ہے، پھول اور خوشبو بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر کوئی ان کو ناجائز نہیں کہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ناجائز ہونے کی وجہ کوئی اور ہے۔

خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ فرماتے ہیں:۔" جو چیز حُسن سے موصوف ہوتی ہے اُس کا تعلق عالم علوی سے ہوتا ہے، اور رُوح انسانی بھی اُسی عالم سے ہے۔ جب وہ نغمۂ خوش سُنتی ہے، یا کسی صورت کے حُسن کا مشاہدہ کرتی ہے تو اُس کو اپنا وطن یاد آجاتا ہے اور وہ بے چین سی ہو جاتی ہے، جس طرح سے کوئی آدمی سفر میں ہو اور اس کے وطن سے خط آجائے تو اس کے قلب کی عجیب حالت ہوتی ہے

یہی حال رُوح کا سمجھ لو۔ (رموزِ عشق)

عید کا دن تھا رسول اللہؐ کے گھر میں چند لڑکیاں گا رہی تھیں، حضورؐ بھی چادر لپیٹے ہوئے آرام فرما تھے، روایت میں یہ ہے کہ لڑکیاں دف بجا کر گا رہی تھیں چونکہ علماء اور صوفیائے کرام کو رسول اللہؐ کے ہر ہر فعل سے محبت ہے اسی فعل سے جواز اور عدم جواز کو ثابت کرتے ہیں۔ جو سماع کے جواز کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی موجودگی میں لڑکیاں گا رہی تھیں، اگر گانا ناجائز ہوتا تو حضورؐ ضرور منع کرتے۔ یہ ان کی سب سے قوی دلیل ہے۔ مگر جو علماء اس کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ عید کا دن تھا اس لئے رسول اللہؐ نے لڑکیوں کو اجازت دے دی تھی تاکہ وہ خوش ہوں، دوسرے لڑکیاں صغیر سن تھیں جوان اور خوبصورت نہیں تھیں کہ کسی فتنہ کا اندیشہ ہو، تیسرے ساز و سامان وغیرہ ان کے ساتھ نہیں تھا جو خلافِ شرع ہے، صرف دَف تھی دَف کے ساتھ گانے کو اکثر علماء نے جائز کیا ہے۔

بہرکیف اس پر اختلاف ہے۔ امام غزالیؒ نے سماع کے موضوع پر خوب مُدلّل بحث کی ہے اور آخر میں ایک جچی تُلی بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"سماع بلاشبہ اچھی چیز ہے۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ دل میں جس کی محبت ہوتی ہے اسی کی محبت کو تیز کر دیتا ہے یعنی محبت عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی کسی کے دل میں اللہ اور رسول پاکؐ کی محبت ہے تو سماع اس کو تیز کر دیتا ہے اسی وجہ سے وجد آتا ہے، اگر کسی شخص کو عورت یا کسی لڑکے سے محبت ہے اس میں شدت لاتا ہے لہذا اگر کسی کے دل میں سماع سے اللہ اور رسولؐ کی محبت پیدا ہوتی ہو تو اس کو سماع سے ثواب ہوگا، اور اگر کسی کے دل میں عورت یا لڑکے کی

محبت شدید ہوتی ہے اس کو سماع سے گناہ ہوگا، اور اگر دونوں اثرات پیدا نہ ہوں تو وہ مباح ہے یعنی نہ عذاب نہ ثواب ۔ ا

(کیمیائے سعادت)

امام صاحب کی یہ بات قرین عقل ہے کیونکہ دل کی حالت کو حق سبحانہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں ———— سماع کو اکثر علماء اس لئے بُرا کہتے ہیں کہ ہر شخص صوفی نہیں بلکہ اکثر لوگ گناہوں میں مبتلا ہیں۔ ہم روزانہ ہی دیکھتے ہیں کہ قوالی ساری رات رہتی ہے نماز فجر کے قریب بند ہوتی ہے دوسروں کا تو کیا ذکر، جو نماز کے پابند ہیں وہ بھی سو جاتے ہیں۔ صوفیاء نے بہت کڑی شرطوں کے ساتھ سماع کو جائز کیا ہے۔ مثلاً گانے والی خوبصورت، جوان عورت نہ ہو، اَمرد (بے ریش) خوبصورت لڑکا نہ ہو، جہاں محفل ہو رہی ہے وہاں حسین عورتوں کا مجمع نہ ہو، آج کل ہر درگاہ میں یا قوالی کے وقت عورتوں کا مجمع ہو جاتا ہے، شہروں میں عورتیں کوٹھے پر آجاتی ہیں اور خوب تاک جھانک ہوتی ہے۔ ایسا نظارہ دیکھ کر ہی معلوم ہوتا ہے کہ علماء نے سماع کو ان ہی وجوہات سے ناجائز کہا ہے۔ پھر بھی اگر کوئی شخص ان سب باتوں میں ملوث نہ ہو کر سماع سُنے، اللہ اور رسولؐ کی محبت میں روئے، آہ کرے، سر دُھنے تو محمود ہے۔ امام غزالیؒ کا مطلب یہی ہے۔

سماع اس قدر اثر رکھتا ہے کہ بعض لوگ وجد کی حالت میں مر گئے۔ بقول غالبؔ "وقت سماع جان ہی نکل گئی" کسی کامل نے کہا ہے "اپنے قلب سے فتویٰ لو" یعنی سماع سننے کے جائز یا ناجائز ہونے کا فتویٰ تمہارا دل ہی دیگا۔ خواجہ نصیر الدینؒ نے صحیح فرمایا ہے کہ حسن اور نغمہ خوش عالم علوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض صوفیاء ایسے بھی گزرے ہیں جن کو کسی حسین عورت یا امرد کو دیکھ کر وجد آجاتا تھا

اور صورت میں ذات حق کا جلوہ دیکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ احد الدین کرمانی فرماتے ہیں ؎

زاں می نگرم بہ چشم سر در صورت زیرا کہ ز معنی ست اثر در صورت
ایں عالم صورت است و ما در صوریم معنی نہ تواں دید، مگر در صورت

یعنی میں حسین صورت کو اس لئے دیکھتا ہوں کہ وہ باطن کو دکھاتی ہے، ہم عالم صورت (یعنی ظاہر) میں ہیں، اور باطن کو صرف ظاہر ہی میں دیکھا جا سکتا ہے

یقیناً سماع اہل دل کو باطن کی طرف متوجہ کرتا ہے بلکہ ان کے دل کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ لہٰذا صرف اس حالت میں سماع محمود ہے۔

غالب نے اس شعر کا تصور مولانا رومیؒ کی مثنوی کے پہلے شعر سے لیا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند وز جدائی ہا شکایت می کند

یعنی بانسری کی آواز گویا روح کی فریاد ہے جو اسی جگہ جانا چاہتی ہے جہاں سے آئی ہے" دوسرے شعر میں اس تصور کو اور واضح کیا ہے ؎

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

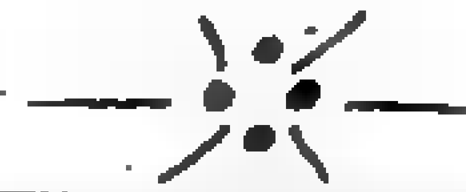
یعنی وہ بانسری یہ شکایت کرتی ہے کہ مجھ کو "نیستاں" سے کاٹ کر دوسرے عالم میں لے آئے ہیں، اب جو میں جدائی میں روتی ہوں تو میرے رونے کے اثر سے مرد و زن روتے ہیں"

غالب کا مطلب یہ ہے کہ چنگ و رباب میں روح کی صدا سمائی ہوئی ہے وہ اپنے مرکز کی طرف جانا چاہتی ہے چونکہ انسان کے جسم میں بھی روح ہے جب چنگ و رباب سے فریاد کی صدا بلند ہوتی ہے تو انسان کی روح بھی اپنے مرکز کی طرف پرواز

کرنے کے لئے تڑپنے لگتی ہے۔ سماع کو اہل ذوق نے اسی لئے پسند کیا ہے کہ وہ اَحَدیت کی طرف کھینچتی ہے کیونکہ ہر نفس کا عین ازل سے ذات حق کے علم میں ہے اس سلسلہ میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ لکھتے ہیں:۔

"روحِ الٰہی کو جو عالمِ پاک سے ہے اور قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ۝ اس کی شان میں ہے اور اس مشتِ خاک یعنی جسم میں محبوس (مقید) ہونے کے سبب سے اپنی اصل کو بھول گئی تھی اور اس کے ادراک کا آئینہ زنگ پکڑ گیا تھا، جب اس تجلّی کے نور سے اس کا چہرہ مُصفّٰی اور مصقول ہو گیا اور کمالاتِ حق کا عکس اپنے اندر دیکھا کہ حدیث اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ (خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی کی طرف اشارہ ہے، اپنی فراموش اصل کو پھر یاد کر کے اصل کی طرف پہونچنے کی خواہش کرتی ہے۔۔۔ لیکن چونکہ بشریت کا غبار خطیرۃ القدس میں پہونچنے سے مانع ہوتا ہے اس لئے ناچار اقتضائے روحانی اور اقتضائے نفسانی کے درمیان کشمکش اور مزاحمت پیدا ہو جاتی ہے۔۔ بالجملہ یہ شورش اور تقلقل جو کہ روحِ نفسانی میں پیدا ہو گئی ہے طالب کو دیوانوں اور مستانوں کی طرح آوارہ پھراتی ہے اور اس کی عقل و فکر کو درہم برہم کر دیتی ہے، اور ربسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قانونِ شرع اور قواعدِ ادب سے باہر کھینچ لے جاتی ہے۔" "صراط مستقیم" صفحہ (۱۱)۔

اس حالت کو مولانا شہیدؒ "حبِ عشقی" کہتے ہیں گانا سن کر جو حالت پیدا ہوتی ہے اس عبارت کو پڑھ کر معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ یہی کششِ باطنی ہے۔



عبرت

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

دنیا کو غمکدہ اسی لیے کہتے ہیں کہ چاروں طرف تکالیف، کرب، بے چینی حادثات، بیماروں کی کراہیں، مظلوموں کی چیخیں، آہ و بکا، آلام و افکار نظر آتے ہیں۔ اگر اس رنج و محن کی دنیا میں کوئی لمحہ خوشی کا آ بھی گیا تو جلد فنا ہو جائیگا۔ حافظ نے بالکل سچ کہا ہے ؎

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم ۔۔۔ جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

"میں اس منزل میں عیش و عشرت کے ایام کس طرح سکون کے ساتھ گذار سکتا ہوں جبکہ وقت تیزی سے گذر رہا ہے اور موت عنقریب آنے والی ہے لہذا جو بھی تغیرات اس دنیا میں ہوں، جو بھی حالات پیش آئیں وہ صرف اس لئے ہیں تاکہ انسان اُن کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔

غالب کا عام شیوہ ہے کہ وہ اہلِ دانش کو بینش کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں حوادث کے جو بھی تھپیڑے لگیں وہ گویا استاد کا طمانچہ ہے جو شاگرد کو ہوش میں لانے کے لئے لگایا جاتا ہے۔ خداوند کریم کی عام عادت ہے کہ کسی انسان کی زندگی یکساں نہیں گذرنے دیتا۔ خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔

فلاسفہ کے نزدیک دُنیا میں خدا کی صفات جلالی و جمالی ہر لمحہ کارفرما رہتی ہیں۔ اسی میں زندگی گذارنا پڑتی ہے۔

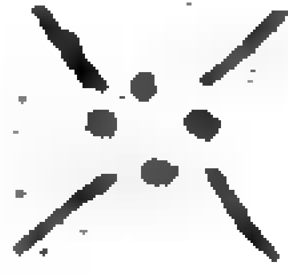
صوفیاء کے نزدیک آلام و تکالیف، فقر و فاقہ اچھی چیزیں نہیں بلکہ نعمتیں ہیں کیونکہ وہ انسان کو اپنے رب کریم کی طرف راغب رکھتی ہیں۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ عیش میں خدا کو بھول جاتا ہے اور جب کوئی مصیبت آتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں مانگتا ہے جس کو قرآن میں "دُعَاءٍ عَرِیْضٍ" کہا گیا ہے، اور جب وہ مصیبت ٹل جاتی ہے تو ایسا بے فکر ہو جاتا ہے گویا اس پر کبھی کوئی مصیبت آئی ہی نہ تھی۔

ساری دنیا میں ہر قدم پر مصیبت اور تکلیف ہے۔ اگر ان مصیبتوں سے بچنا چاہتے ہو تو خلوت گاہِ حق میں پہونچ جاؤ۔ عارف کامل مولانا رومؒ نے صحیح فرمایا ہے ؎

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست　　　جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

دنیا کے ہر گوشہ میں کوئی بھیڑیا ہر کونے میں کوئی دام فریب میں ملے گا۔ اگر دنیا میں کہیں آرام و سکون ہے تو ذکر الٰہی میں ہے۔ دنیا کے واقعات محض عبرت کے لئے ہوتے ہیں۔ اگر تم کو کوئی تکلیف پہونچے تو سمجھ لو کہ اس سے بڑی تکلیف بھی پہونچ سکتی ہے۔ غرض دنیا میں جو کچھ بھی مصیبتیں ہیں وہ گویا اُستاد کا طمانچہ ہیں جو بندوں کا دماغ درست کرنے کے لئے ہیں۔ مارنا، جلانا، رلانا اور ہنسانا سب خدا کی طرف سے ہے۔ عقلمند وہ ہے جو ان حوادث میں ثابت قدم رہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تم کو بری معلوم ہو مگر وہ تمہارے واسطے حقیقت میں مفید ہو۔ قرآن میں اس نکتہ کو بڑے ہی دل نشین انداز میں

سمجھایا گیا ہے۔ اور جب خدا دیکھ رہا ہے تو کوئی فکر کی بات ہی نہیں فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا (حق سبحانہٗ نے رسول اللہ ؐ کو کہا ہے کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے)



وحدت فی الکثرت

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافر، اِن اصنامِ خیالی نے مجھے

غالب بھی اُن ہی صوفیاء کے ہم زبان ہیں جو ایک ہی وجود مانتے ہیں اور کثرت کو وہم سمجھتے ہیں۔ غالب کا مذکورہ شعر اسی عقیدے کا ترجمان ہے۔ وہ ایک خط میں خود لکھ چکے ہیں اور کئی مرتبہ خود بھی زبان سے اقرار کر چکے تھے کہ ذات (وجود) ایک ہے۔ وہی عقیدہ انھوں نے اس شعر سے ظاہر کیا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ صرف وحدت ہی کائنات کی ہر شے میں کارفرما ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ہم کثرت اور اشیاء کی مختلف شکلوں کو حقیقت سمجھنے لگیں تو یہ وہم کی پرستش ہوگی یہاں وہ کہتے ہیں کہ اگر میں اِن اَصنامِ خیالی کو حقیقت سمجھنے لگوں تو کافر ہو جاؤں۔ بہ الفاظ دیگر یہ جو کچھ نظر آ رہا ہے سب وہم ہے موجود در اصل ذاتِ اَحد ہی ہے محققین صوفیاء کا تصور یہ ہے کہ ان اشیاء کی صورتوں میں مصروف ہو جانا غفلت ہے اور یہ خدا کی حکمت ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک مکتوب میں لکھا ہے: "شیخ الاسلام ہرویؒ میفرماید کسیکہ مرا یک ساعت از حق سبحانہٗ غافل سازد، امیدست کہ گناہان او ربہ بخشند۔ وجود بشریت را غفلت در کار است۔ حق سبحانہٗ و تعالیٰ از کمال کرم خویش ہر یکے را

ایشاں بہ اندازۂ استعداد بہ امور یکہ مستلزم غفلت اند ظاہر ایشاں را برآں امور مشغول ساختہ است جمع را بہ سماع و رقص الفت دادہ و طائفہ را تصنیف کتب و تحریر علوم و معارف شعار ساختہ و گروہے را بہ بعضے امور مباح مشغول داشتہ۔ (مکتوب نمبر ۲۹۱ جلد اوّل)

یعنی شیخ الاسلام ہرویؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص مجھ کو تھوڑی دیر کے لئے بھی حق سبحانہٗ سے غافل کر دے تو اُمید ہے کہ خدا اُس کے گناہوں کو بخش دیگا۔ اس میں راز یہ ہے کہ بشر کے وجود کے لئے غفلت ضروری ہے۔ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے انتہائی کرم سے ہر شخص کو اُس کی استعداد کے مطابق غافل کر دیا ہے اور ایسے کاموں میں مصروف کر دیا ہے جو اُس کی طبیعت کے مطابق ہیں کسی کو سماع و رقص میں مصروف کر دیا، کسی کو کتابوں کی تصنیف میں لگا دیا اور بعض کو دیگر مُباح باتوں میں مشغول کر دیا ہے"۔

حضرت مجددؒ ایک جگہ "فصوص الحکم" (مصنفہ شیخ اکبرؒ) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ایک مرتبہ مجھے فنائے حقیقی حاصل ہوئی اور دل کو اس قدر وسعت پیدا ہوئی کہ تمام عالم کو، عرش کو، بلکہ خود کو، بلکہ عالم کے تمام ذرّات کو حق دیکھا، بلکہ عالم کے تمام ذرّات کو اپنا عین دیکھا۔ سارے عالم کو ایک ذرّہ میں گم پایا، پھر میں نے اپنے آپ کو اور ہر ذرّہ کو نور پایا۔ دنیا کی اشیاء کی صورتیں اُس نور میں مضمحل ہو گئیں۔ جب میں نے حق سبحانہٗ سے عرض کیا کہ یہ کیا ہے تو فرمایا کہ توحید میں حق الیقین کا مرتبہ یہی ہے۔ اور اِس مقام کو "جمع الجمع" کہتے ہیں۔ اِس کے بعد میں جن ذرّاتِ عالم کو حق دیکھ رہا تھا پھر میں نے ان ہی ذرّات کو

موہوم پایا۔ اس حالت پر مجھے بہت حیرت ہوئی، اسی اثناء میں
میں نے پدر بزرگوار سے "فصوص الحکم" کی عبارت سنی تھی وہ یہ ہے
"ایک حالت ایسی ہوتی ہے اگر تو چاہے تو کہہ دے کہ یہ عالم حق ہے
اگر چاہے تو کہہ دے کہ یہ عالم خلق ہے چونکہ ان میں تمیز نہیں ہو سکتی
لہذا یہ مقام حیرت ہے"۔ اس عبارت سے کچھ تسکین ہوئی، اس
کے بعد عنایت خداوندی سے موجود حقیقی (خدا) کو موہوم متخیّل سے
جُدا پایا"۔

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ عارف پر ہر لمحہ مختلف مقامات گذرتے ہیں۔
"وحدت فی الکثرت" حالتِ سکر (بے ہوشی) ہے، حالتِ صحو نہیں ہے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی عارف کو حق محسوس ہوتا ہے اور خلق
معقول، اور کبھی خلق محسوس ہوتی ہے اور حق معقول ہے۔ عارف کی حالتیں
بدلتی رہتی ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔ لَامَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہ
اور لَامَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ میں فرق ہے، جن کی حالت وحدت فی الکثرت
کی ہے وہ لَامَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ کا ہی نعرہ لگاتے ہیں۔ خود مرزا غالب نے
ایک جگہ لکھا ہے "تنہائی میں میرا ورد یہ رہتا ہے "لَامَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ"
مرزا غالب کے الفاظ اور اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا "فنا کی حالت"
میں بہت عرصہ تک رہے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی مکتوبات جلد اوّل کے صفحہ ۱۸۱ پر لکھتے ہیں:۔
"دریں مرتبہ حق را سبحانہ نہ متّصل عالم یافت و نہ منفصل، نہ داخل

عالم نہ خارج نسبت معیت واحاطہ وسریان بر نہجیکہ اوّل می یافت
بالکلیہ منتفی گشت "

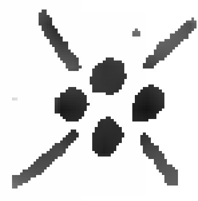
یعنی اس حالت میں میں نے نہ حق سبحانہٗ کو عالم سے متصل پایا نہ اس سے دور، اور، نہ عالم میں داخل پایا نہ عالم سے خارج۔ مجھ پہلے معیت واحاطہ کی جو نسبت معلوم ہو رہی تھی وہ بالکل معدوم ہو گئی "

پھر تحریر فرماتے ہیں :۔

" معلوم گشت کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ را بہ عالم نسبتے است ورار ایں
نسبت مذکورہ وآں نسبت مجہول الکیفیّت است "

یعنی مجھے معلوم ہوا کہ حق سبحانہٗ کو عالم سے اس نسبت کے علاوہ کوئی اور نسبت ہے اور وہ نسبت ایسی ہے کہ جس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی "

اس ساری عبارت کا مطلب یہ ہے کہ عالم کو اشیاء کی کثرت میں جو وحدت نظر آ رہی ہے وہ ذوقی ہے، ہر عارف کے ذوق کے مطابق "، اور برکلے کے قول کے مطابق جو چیز جس کو محسوس ہو رہی ہے وہ اس کے لئے موجود ہے "



تصوّف میں مختلف مراتب

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

غالب کا یہ شعر عشق حقیقی کے متعلق ہے اس میں کسی صورت سے بھی عشق مجازی نہیں۔ ہر آدمی خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس حقیقتِ مُستتر کو پانے کی کوشش کرتا ہے، حق سبحانہٗ کی بارگاہ لا انتہا ہے۔ مولانا رُومیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی بارگاہ بے نہایت ہے ع

صد ہزاراں پردہ آمد تا اِلٰہ

"اللہ تک لاکھوں پردے ہیں" اُن کی ذات پاک کا خاصہ ہے جو بھی اُن تک پہونچنا چاہتا ہے اُس کو روکتے نہیں۔ "برہمن ازم" میں اس کو "دھیان" کہتے ہیں۔ افلاطون بھی اپنی قوتِ متخیلہ کی بدولت "وحدت الوجود" کی منزل تک پہونچ گیا۔ باوجودیکہ اس نے نبیؑ کی تعلیم کو ماننے سے انکار کر دیا اور صاف اعلان کر دیا تھا "ہم ہدایت یافتہ لوگ ہیں ہم کو اس کی ضرورت نہیں کہ کوئی شخص ہم کو راہِ ہدایت دکھائے"

حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے ایسے فلسفیوں کے بارگاہِ الٰہیہ کے قریب پہونچنے کی حقیقت خوب بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ایسے لوگوں کا شہنشاہ

کی مملکت تک پہونچنا ایسا ہے جیسے کوئی ڈاکو شہنشاہ کے کسی قلعہ تک پہونچ جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس ذریعہ مُطیع پہونچتے ہیں وہ بھی پہونچ گیا ہے مگر مطیع کے پہونچنے سے شہنشاہ راضی ہے اور اس کو ہمیشہ رہنے کی اجازت دے سکتا ہے مگر جو چوری، ڈاکہ، یا مکّاری سے پہونچتا ہے اس کو شہنشاہ وہاں سے نکلوا دیتا ہے بلکہ وہ سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔

جو صوفیائے کرام بارگاہِ عالیہ تک پہونچے ہیں ان کے مختلف مراتب ہیں۔ حق سبحانہٗ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ مقرّب نبی ﷺ ہوتا ہے، اس کے بعد صحابی رضی اللہ عنہ، جس کو نبی سے سب سے زیادہ روحانی فیض پہونچتا ہے۔ اولیائے کرام کو بھی حسب استعداد فیض پہونچتا ہے۔ بعض مومن ولی کا مرتبہ رکھتے ہیں مگر اُن کو کوئی نہیں جانتا کہ یہ ولی ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ "ارشاد الطالبین" میں لکھتے ہیں کہ بعض ولی کو تو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ولی ہے دوسروں کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ ان اولیاء میں بہت سے مرتبے مشہور ہیں۔ غوث، قطب، ابدال، محدّث، مجدّد، محبوب، مجذوب، قلندر، وغیرہ۔ بعض ولی اُویسی ہوتے ہیں جو کسی کے مُرید نہیں ہوتے مگر اللہ یا نبی سے براہ راست (بلا واسطہ) اخذِ فیض کرتے ہیں جیسے اویس قرنیؓ۔ ان میں بعض مومنین اللہ کو طلب کرتے ہیں، اس سے محبت رکھتے ہیں اور بعض ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کو حق سبحانہٗ خود منتخب کر لیتے ہیں۔ قرآن میں اس کا ثبوت موجود ہے اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ ؁ حق سبحانہٗ جس کو چاہتے ہیں اُس کو منتخب کر لیتے ہیں اور اُن آدمیوں کو بھی ہدایت دیتے ہیں جو اُن کی طرف پہونچنا چاہتے ہیں۔

صوفیاء میں چار فرقے بہت مشہور ہیں۔ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ صابریہ، سہروردیہ۔ اللہ تک پہونچنے کے اور بھی لاتعداد طریقے ہیں۔ اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو صوفی شریعت کا زیادہ اتباع کرے گا وہی حق سبحانہٗ سے زیادہ قریب ہے۔ ایک حدیث ہے کہ فرائض سے زیادہ کوئی عمل حق سبحانہٗ سے قریب کرنے والا نہیں۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ رسول اکرمؐ کے قدم بہ قدم چلنے والا صوفی زیادہ کامل ہوگا۔ شیخ سعدیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مُرید تھے، فرماتے ہیں ؎

محال است سعدیؒ کہ راہِ صفا	توان رفت جز بر پئے مصطفےؐ

یعنی اے سعدی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے کو چھوڑ کر اور راستے سے راہ صفا یعنی تصوف کے راستے پر چلنا محال ہے۔

ان ہی نے "گلستاں" میں اشارہ کیا ہے ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی	کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

یعنی اے اعرابی مجھے ڈر ہے کہ تو کعبہ نہیں پہونچ سکے گا۔ کیونکہ جس راستے پر تو چل رہا ہے وہ ترکستان جاتا ہے"

کسی بزرگ سے مرید ہونا محمود ہے مقصود نہیں۔ ہزاروں اللہ کے دوست ایسے گذرے ہیں جو کسی سے مُرید نہیں ہوئے، البتہ اُستادوں کے معتقد تھے ان کا احترام کرتے تھے، ان میں اکثر ائمہ مجتہدین شامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوافل اور قرآن خود خدا سے قریب کرنے والے ہیں۔ ایک حدیث قدسی ہے:۔

"میرا بندہ مجھ سے نوافل کے ذریعہ تقرب حاصل کرتا ہے یہانتک کہ میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ

ہوجاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے۔ اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے پکڑتا ہے اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے چلتا ہے۔" (بخاری)

دیکھئے اس میں مُرید بننے کا ذکر نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مُرید نہ ہونا چاہیئے بلکہ مرید ہونا نفل چیز ہے اگر نہ ہو تو کوئی مواخذہ نہیں۔ ہر بندے کا اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق ہے اور نبیؐ کا واسطہ کافی ہے۔

اس طرح نفل عبادت سے بندہ بقول شبلیؒ "متصل بالحق اور منقطع عن الخلق" ہوجاتا ہے۔ غالبؔ نے اس موقع کا نفیس شعر کہا ہے ؎

بندہ را کہ بہ فرمانِ خدا راہ رَوَد   نہ گذارند کہ دربندِ زلیخا باشد

یعنی جو بندہ اللہ کے حکم پر عمل کرے اس کے بتلائے ہوئے راستے پر چلے اس کو حضرت یوسفؑ کی طرح زلیخا کی قید میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ غالبؔ کی بلند پروازی قابل داد ہے۔ یعنی جو بندہ اللہ کا ہوجاتا ہے اس کو حق سبحانہٗ غیر میں مشغول نہیں رکھتے۔

"بند زلیخا" لفظ کی داد نہیں دی جا سکتی۔ یعنی زلیخا کی قید میں اس کو نہیں چھوڑتے ہیں"۔

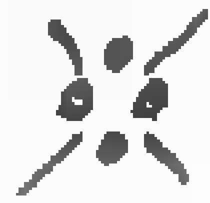
دوسرا مطلب یہ ہے کہ حق کے فرماں بردار بندے کو انسان کا محتاج نہیں رکھتے بلکہ غیر سے بالکل منقطع کر دیتے ہیں اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (کیا اللہ اپنے بندوں کے لئے کافی نہیں ہے؟")

بعض صوفیاء نے قرآن کے اس فقرے سے وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ سے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ اللہ تک رسائی کے لئے کسی کامل سے مُرید ہونے کی طرف اشارہ ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ خداوند قدوس کو وہ

سارے طریقے پسند ہیں جو بندہ کو ان کی بارگاہِ عالیہ تک پہونچا ئیں۔

ایک حدیث ہے "دُنیا اللہ کے نزدیک ملعون ہے مگر ذکر الہٰی اور جو چیز بھی ذکر میں معاون ہو سکے"۔ اسی لئے اللہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کسی مرشد کامل سے بیعت ہو جانا اللہ تک پہونچنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں سے ہی جنّت کا وعدہ کر رکھا ہے) ہو سکتا ہے مسلمانوں کے ان کی استعداد کے لحاظ سے مختلف مرتبے ہوں مگر اُن کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ اس سے ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی نا امید نہیں ہے۔ اس آیت شریفہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے اللہ عزّ وجلّ کا جو تصوّر پیش کیا ہے وہ اور کسی مذہبی کتاب نے پیش نہیں کیا۔ "اللہ" کا لفظ اس قدر مؤثّر ہے جو ساری صفات کو جامع ہے۔



دُنیا کی بے ثباتی

ہاں! کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے" "نہیں" ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

عالم حادث یعنی فنا پذیر ہے" یہ فلسفیوں کا متفقہ مسئلہ ہے۔ البتہ متاخرین دنیا کے فنا ہونے کے قائل نہیں۔ اسی طرح اشراقی حکماء بھی عالم کو فنا پذیر نہیں مانتے۔ اور وہ کیسے فنا پذیر مان سکتے ہیں جبکہ وہ کائنات کو ذاتِ خداوندی کا ظلّ (پرتو) سمجھتے ہیں۔ چونکہ ذات قدیم (غیر فنا پذیر) ہے لہٰذا اس کا ظلّ بھی قدیم ہوا۔ دیکھئے انسان کو اگر نبوت کا فیض نہ پہونچا تو عقل گمراہی کے بھنور میں کتنی ڈبکیاں لیتی۔ جن حکماء کو نبوت کا فیض نہیں پہونچا ہے ان کی اکثر باتیں احمقانہ ہوتی ہیں۔

شوپنہار (مشہور فلاسفر) نے صحیح کہا ہے:۔

"دنیا میں کوئی مہمل سے مہمل بات ایسی نہ ملے گی جس کا باور کرنے والا کوئی عاقل سے عاقل فلسفی نہ ملتا ہو، اب اتنے مفروضات پیدا ہو گئے ہیں کہ صحیح سے صحیح اصول کی نسبت گمان ہوتا ہے کہ وہ

کسی واقعیت کا پرتو نہیں بلکہ انسانی ذہن کی ایجاد ہے۔"

(سیرۃ النبیؐ از علامہ شبلیؒ)

غالب کے مذکورہ بالا دونوں اشعار کا مطلب بادی النظر میں یہ ہے کہ ساری دنیا موہوم ہے۔ فلسفیوں نے آج تک جو حماقتیں کی ہیں وہ بہت مضحکہ خیز ہیں۔ مثلاً فلسفیوں کا ایک گروہ گذرا ہے جو "سوفسطائی" کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے عقیدہ کو "سفسطہ" کہتے ہیں۔ "سفسطہ" کہتے ہیں "ہر چیز کو موہوم سمجھنے کو"۔ سوفسطائی حکماء کہتے ہیں کہ ساری کائنات موہوم ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ چونکہ ظاہراً یہ شعر بھی ان کے عقیدہ کی تائید کر رہے ہیں لہٰذا ہم کو اس کا الگ باب قائم کرنا پڑا۔ نازک مسئلہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ بعض صوفیاء بھی اس کائنات کو وہم کے مرتبے میں رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ حال سے مغلوب ہو گئے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اس مسئلہ کی نزاکت سے بے خبر نہ تھے چنانچہ انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:۔

"صوفیاء کہ عالم را موہوم گفتہ اند نہ بداں معنی ست کہ عالم محض اختراع و تراشِ وہم ست کہ مذہب سوفسطائی بے خرد ست بلکہ موہوم بہ آں معنی ست کہ در مرتبۂ وہم بخلق خداوندی جل شانہٗ مخلوق گشتہ است و دراں مرتبہ بہ صنع او تعالیٰ ثبوت و استقرار پیدا کردہ لیکن خیر و کمال کہ دروے ثابت است مستعار از حضرتِ وجود است تعالیٰ و تقدس و ظلے ست از ظلال کمالات آں مرتبہ مقدسہ و شر و نقص کہ در وے کائن ست مستعار از عدم است۔" (مکتوب ۹۷ جلد سوم)۔

یعنی صوفیائے کرام نے جو کائنات کو موہوم کہا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ ساری دنیا محض وہم ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ یہ عقیدہ تو سوفسطائی فلسفیوں کا ہے

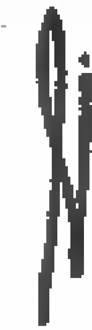
جو بالکل بے عقل ہیں بلکہ صوفیاء کے نزدیک دنیا کا موہوم ہونا یہ ہے کہ خدائے قادر نے عالم کو وہم کے مرتبہ میں پیدا کر دیا ہے، اور خالق کی صنعت کا ایک کرشمہ ہے۔ بلکہ کائنات سے ثابت ہے اس سے خدا کا خیر و کمال ظاہر ہے اور وہ ذات واجب الوجود کا فیضان ہے اور اس کائنات میں جو نقص اور شر نظر آتا ہے وہ سب عدم کے اثر سے آیا ہے۔

اور واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ اس دنیا میں نیکی کے بدلے میں جنت اور برائی و کفر کی پاداش میں دوزخ ملتی ہے۔ اگر یہ سب وہم ہوتا تو انسان کے متعلق حکیم مطلق اتنا بڑا فیصلہ نہ کرتا۔ لہذا غالب کے جن اشعار میں "وہم" معلوم ہوتا ہے اس کو دنیا کے حدوث اور فنا پذیری کی طرف اشارہ تصور کیجئے۔ ایسا ہی غالب کا ایک اور شعر ہے ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

مشہور فلاسفر برکلے کا قول ہے کہ "جو چیز محسوس ہے وہ موجود ہے۔ اس اصول کے مطابق دنیا محسوس ہو رہی ہے لہذا موجود ہے۔" برکلے کا یہ قول یاد رکھیے آئندہ متعدد مقامات پر اس کی ضرورت پڑے گی۔ خواب کو عام لوگ محض وہم سمجھتے ہیں مگر اس اصول کے مطابق جس عالم میں بھی کوئی چیز محسوس ہو وہ دیکھنے والے کے نزدیک موجود ہے، جس کو محسوس نہیں ہو رہی ہے اس کے لئے موجود نہیں ہے۔





توکّل

اس کی اُمّت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھُلا

مرزا غالبؔ نے تصوف میں یہی شعر آسان کہا ہے۔ توکّل کیا ہے؟ توکّل کے معنی "کسی قابلِ اعتماد وکیل کو اپنا کام سونپ کر خود مطمئن اور بے فکر ہو جانا" لیکن کسب ضروری ہے پتھر کی طرح پڑا رہنا خلاف عقل و شرع ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

گر توکّل می کُنی، دَر کار کُن کسب کن، پس تکیہ بر جبّار کُن

"یعنی اگر توکّل کرنا ہے تو دو کام کر، پہلے کسب کر اس کے بعد خدا پر بھروسہ کر"۔ روزی کے لئے دوڑ دھوپ کرنا توکّل کے منافی نہیں۔ حضرت مجدّد فرماتے ہیں "توسّطِ اسباب منافیٔ توکّل نیست"۔ (مکتوب ۲۶۶ جلد اوّل) اسی مکتوب میں فرماتے ہیں۔ "حق سبحانہٗ و تعالیٰ ہر شخص کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہے، جو اسباب سے مدد لیتا ہے اس کو اسباب کے ذریعہ مدد ملتی ہے اور جو اسباب پر نظر نہیں رکھتا اس کا کام اسباب کے بغیر بھی کر دیتا ہے۔ یہ حدیث قدسی اس کا ثبوت ہے" اَنَا عِندَ الظَّنِّ عَبدِیْ بِیْ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہی اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں جو بھی گمان میرے ساتھ رکھتا ہو"

اللہ سبحانہ نے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، عقل وغیرہ اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ انسان اُن سے کام لے۔ ان اعضاء کی ہیئت ہی تقاضا کر رہی ہے کہ اُن سے کام لیا جائے بلاشبہ احتیاج اور مصائب انسان کو اپنے خالق کی طرف بلا ارادہ راغب کرتے ہیں۔ انسان جب عیش میں ہوتا ہے تو اللہ کو بہت کم یاد کرتا ہے بلکہ بھول ہی جاتا ہے حالانکہ عیش و کامرانی میں اس کا زیادہ شکریہ ادا کرنا چاہیئے تھا۔ انسان کو بقدر ضرورت بلا قرض روزی ملے اور تندرست رہے اپنے خالق کو یاد کرے بس گویا اس کو سلطنت ملی ہوئی ہے۔ حدیث ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ ..... الخ، یعنی وہ بیشک مُراد کو پہونچا جو مسلمان ہُوا۔ اس کو بقدر ضرورت روزی ملی اور اللہ نے اس کو جتنا دیا اُس پر قناعت نصیب کی۔" (مسلم بروایت عبداللہ ابن عمرؓ)

امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم الدین" میں توکّل کا راز اپنے فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے، فرماتے ہیں :۔

"توکّل در اصل توحید کا نام ہے۔ توحید کے اعتقاد سے ایک حالت طاری ہوتی ہے اور اس حالت کی وجہ سے وہ مخصوص افعال صادر ہوتے ہیں جن کو توکّل کہتے ہیں۔ لیکن پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ (۱) زبانی اقرار۔ (۲) اعتقاد قلبی اور اقرار زبانی (۳) کشف کے ذریعہ یہ مشاہدہ ہونا کہ تمام افعال ذات باری سے صادر ہوتے ہیں، اسباب و وسائط کو کچھ دخل نہیں۔ (۴)۔ یہ مشاہدہ ہونا کہ عالم میں ذات باری کے سوا اور کوئی شئے موجود نہیں"

ان مراتب چہارگانہ میں پہلے دو مدارج کو توکّل کے وجود میں کچھ دخل نہیں، توکّل کی ابتداء تیسرے درجے سے شروع ہوتی ہے

یعنی بذریعہ کشف یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی علّت صرف ذاتِ باری ہے۔ بیچ کے اسباب اور وسائط بالکل بیکار ہیں، جس طرح بادشاہ کوئی حکم بذریعہ تحریر نافذ کرتا ہے تو کاغذ، قلم اور دوات کو اُس حکم کی علّت نہیں کہہ سکتے۔ تو انسان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے سوا اور اسباب اُس کی نظر سے بالکل چھپ جاتے ہیں، اس حالت میں جو کچھ کہتا ہے خدا سے کہتا ہے، جو کچھ مانگتا ہے خدا سے مانگتا ہے، اسی کا نام "توکّل" ہے۔ (الغزالی صفحہ ۶) .....

پھر بھی امام صاحب اسباب پر زور دیتے ہیں کیونکہ انبیاء کا یہی طریقہ ہے انھوں نے صاف طور پر فرمایا ہے:۔

"اسبابِ قطعی کو نہیں چھوڑنا چاہیئے جو اسبابِ قطعی کو چھوڑ دیگا وہ مجنون ہے"۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:۔ فَهٰذا جُنُوْنٌ وَلَيْسَ مِنَ التَّوَكُّلِ مِنْ شَيْءٍ الخ... یعنی اسباب سے مدد نہ لینا محض جنون ہے، اس کو توکّل سے کچھ بھی لگاؤ نہیں"۔ کیونکہ مثلاً اگر تم اس بات کے منتظر ہو کہ خدا تم کو روٹی کے بغیر سیر کر دے گا یا روٹی کو یہ قوت دیدے گا کہ وہ خود تم تک چلی آئے، یا کوئی فرشتہ مقرر کر دے گا کہ روٹی کو چبا کر تمہارے منہ میں ڈال دے تو تم نے اللہ سبحانہٗ کی عادت کو بالکل نہیں پہچانا"۔ (احیاء العلوم)

دراصل احتیاج سے توکّل پیدا ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ، حضرت ابوذر غفاری رضؓ اور دیگر بزرگانِ دین سارا روپیہ پیسہ اس لئے خیرات کر دیا کرتے تھے کہ احتیاج

باقی رہے، مومن خدا سے دعا کرے، اس کے آگے گڑگڑائے اور اس میں توکّل کی صفت پیدا ہو، اسباب سے مدد لے لیکن اسباب پر بھروسہ نہ کرے۔ حق سبحانہٗ خود ترغیب دے رہے ہیں۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ؟ کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں؟۔

جو بندہ اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ سبحانہٗ اس کے وکیل بن جاتے ہیں۔ انسان وکیل پر کب بھروسہ کرتا ہے؟۔ (۱) وکیل مؤکّل کے کیس کو خوب جانتا ہو (۲) وکیل انتہائی دانش مند ہو۔ (۳) وکیل مؤکّل کا خیر خواہ ہو۔ (۴) وکیل مؤکّل کا حق دلانے پر قادر ہو۔ (۵) وکیل مؤکّل کی پوری زندگی اور اس کی خواہشات سے واقف ہو"

اب خود انصاف کیجئے اللہ سے بڑا دانش مند کون ہو سکتا ہے۔ سارے انسانوں کو اسی کے پرتو سے عقل ملی ہے۔ اللہ کا علم بسیط ہے۔ پیدائش سے پہلے سے ابد تک کو وہ جانتا ہے۔ خود قرآن میں سوال کیا ہے" کیا وہ بھی نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے؟"

کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

از خدا خواہم و از غیر نہ خواہم بخدا — کہ نیم بندۂ دیگر، نہ خدائے دگرست

خدا کی قسم میں خدا ہی سے طلب کروں گا دوسرے سے نہیں مانگوں گا کیونکہ میں خدا کے سوا کسی اور کا بندہ نہیں ہوں اور نہ کوئی اور خدا ہے۔



انسان

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

آدمی کروڑوں بلکہ اربوں ہیں لیکن انسان بہت کم ہیں۔ اگر عقل وشعور نہ ہو، آدمی اخلاق سے مزیّن نہ ہو تو پھر وہ بھی ایک حیوان ہے خواہ اُس کو حیوان ناطق ہی کیوں نہ کہیں۔ چوپائے بھی کھاتے ہیں پیتے ہیں، بول وبراز کرتے ہیں، نفع کی چیز کی طرف دوڑتے ہیں مضر چیزوں سے بھاگتے ہیں۔ انسان اگر اشرف المخلوقات ہے تو محض اس لئے کہ وہ عقل رکھتا ہے اپنے خالق کو پہچانتا ہے۔ انسان کو معرفت کے لئے ہی دنیا میں لائے ہیں۔ انسان کو صوفیاءؒ عالم صغیر کہتے ہیں یعنی چھوٹی سی کائنات۔ اس کی ہڈیاں جمادات ہیں، اس کے بال نباتات، اس کی رگوں میں خون اُسی طرح ہی بہتا ہے جس طرح دریاؤں اور نہروں میں پانی۔ اس کو بھوک پیاس اُسی طرح لگتی ہے جس طرح ایک بیل یا گھوڑے کو۔ مگر معرفت کی استعداد کا یہ عالم ہے کہ فرشتوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے بلکہ مسجود ملائک بنتا ہے۔ غالب نے انسان کی پستی اور بلندی کی طرف بڑا حسین اشارہ کیا ہے ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

خالقِ کائنات نے انسان میں کمالات کا انبار لگادیا ہے ۔شہوت اور غضب یعنی قوّتِ بہیمیہ بھی اس کو عطا کی ہے ، اسی لئے اس میں چوپایوں جیسی صفات بھی ہیں ۔ اور قوتِ مَلکیہ بھی دی ہے یعنی فرشتوں کی سی خصلت ۔ قوتِ بہیمیہ کو زمین سے مدد ملتی ہے اور قوتِ مَلکیہ کو آسمان سے ۔ بالفاظ دیگر رُوح عالمِ علوی کی چیز ہے اور جسم عالمِ سفلی کی ۔ جب انسان کی روح جسم سے جدا ہوتی ہے تو جسم زمین پر ہی رہ جاتا ہے اور روحِ انسانی عالمِ بالا یعنی عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہے ۔ قرآن کے مطابق جیسا کہ امام غزالیؒ نے بھی تصریح کی ہے انسان کو صرف اس لئے دُنیا میں لائے ہیں کہ آخرت میں حق سبحانہٗ کے نزدیک رہنے کی لیاقت پیدا کرے ، اگر انسان دنیا میں صرف تن پروری میں مصروف رہے تو وہ بہت بڑا احمق ہے ، یعنی ایسی چیز میں مصروف ہوجائے جو عارضی ہے ۔ جو انسان معرفت اور عبادت میں مشغول رہے وہ بڑا عقلمند ہے کیونکہ ایسے عالَم کے لئے تیاری کر رہا ہے جہاں ہمیشہ رہنا ہے ۔

انسان میں اس کے اعمال سے رُوح متأثر ہوتی ہے ۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ انسان میں شہوت اور غضب دو بڑی صفات ہیں ، اُن سے متعدد صفات پیدا ہوتی ہیں ۔ حکیم و فلسفی ارسطو نے ایک کتاب "تہذیب الاخلاق" لکھی ہے ۔ اس میں انسان کے اخلاق پر خوب روشنی ڈالی ہے ۔ بالفاظ دیگر اس نے بتلایا ہے کہ آدمی انسان کس طرح بنتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے :-

"انسان میں دو باتیں خاص ہیں خَلق اور خُلق ۔ اگر ہم کہیں کہ فلاں شخص کا خَلق اور خُلق دونوں اچھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا ظاہر بھی اچھا ہے باطن بھی منطق کی رُو سے خُلق کی تعریف اس طرح کی جاتی

ہے" رُوح میں ایسے ملکۂ راسخہ کا پایا جانا کہ جس کی وجہ سے انسان سے اچھے یا بُرے افعال بے تکلّف آپ سے آپ سرزد ہوں ۔ خُلق کے لیے افعال کا صادر ہونا شرط نہیں ۔ مثلاً ممکن ہے کہ کوئی شخص شجاع ہے یا سخی ہے مگر اس کو شجاعت یا سخاوت کا مظاہرہ کرنے کا موقع نہیں ملا ، تو اس کو ہم شجاع اور سخی کہہ سکتے ہیں ۔ غضب اور شہوت سے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں ۔ مثلاً غضب کی قوت میں اگر افراط و تفریط نہ ہو ، وہ عقل کے قابو میں ہو تو اس کو شجاعت کہتے ہیں ۔ اگر افراط کی طرف مائل ہوگی تہوّر کہلائے گی اور تفریط کی طرف جُھکے گی تو بزدلی ، کم حوصلگی ، احساس کمتری پیدا ہوں گی " شہوت میں اگر اعتدال ہو تو اس سے عفّت پیدا ہوگی ۔ عفّت مختلف سانچوں میں ڈھل کر یہ صفات پیدا کرتی ہے جُود ، حیا ، صبر درگذر ، قناعت ، پرہیزگاری ، لطیف مزاجی ، خوش طبعی ، اور بے طمعی " افراط و تفریط ہونے سے حرص ، طمع ، بے شرمی ، فضول خرچی ریا کاری ، رندی ، اوباشی ، بیجا خوشامد ، حسد ، رشک جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں " عقل کا بھی یہی حال ہے ، عقل کی قوت معتدل رہتی ہے تو حُسن تدبیر ، جودتِ ذہن ، اصابت رائے پیدا کرتی ہے ۔ اس میں افراط آتا ہے تو مکر ، فریب ، حیلہ سازی ، عیاری جیسے اخلاق پیدا ہوتے ہیں تفریط ہوتی ہے تو حماقت ، سادہ لوحی ، نافہمی اور ناعاقبت اندیشی پیدا ہوتی ہیں ۔ یہ معلومات ارسطو سے ابن مسکویہؒ نے لیں ، اور ابن مسکویہؒ سے امام غزالیؒ نے فائدہ اٹھایا ہے " (الغزالی صفحہ ۶۴ و ۶۵)

صوفیاء انسان کو "عالم صغیر" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سارے عالم کا خلاصہ ہے۔ اس میں حد درجہ کی جامعیت ہے۔ حق سبحانہٗ نے کمال یہ کیا ہے کہ انسان کی جامعیت ہی قُرب کا سبب ہے اور اُس کی جامعیت ہی بُعد کا سبب ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے خان خاناں کے نام جو مکتوب ؁ جلد اوّل میں لکھا ہے اُس کو اس طرح شروع کیا ہے "در بیان آنکہ آدمی را جامعیت اُو سبب بُعد است، ہمچنانکہ ہمیں جامعیت او سبب قرب اوست"۔ اس کے بعد یہ حدیث قدسی لکھی ہے "لَا یَسَعُنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَلٰکِنْ یَسَعُنِیْ قَلْبُ عَبْدِیَ الْمُؤْمِنِ" (یعنی نہ میں زمین میں سما سکتا ہوں نہ آسمان میں بلکہ اپنے بندہ مومن کے قلب میں سما سکتا ہوں"۔ اس کے بعد فرماتے ہیں "پس بہترین ہمہ موجودات انسان آمدو بدترین ہمہ کائنات ہم او"۔ یعنی لہٰذا سب موجودات میں بہترین مخلوق انسان ہی ہے اور کائنات میں بدترین بھی وہی"۔ بہترین میں محمدؐ کا نام مبارک مثال میں پیش کیا ہے اور بدترین میں ابوجہل کا"۔ اگر انسان شریعت کا اتباع کرے، معرفت حاصل کرے تو انسان بہترین خلائق ہے اگر کفر و شرک اختیار کرے تو مخلوقات میں بدترین بھی وہی ہے کیونکہ اور جانداروں کے لئے عذاب ابدی نہیں ہے مگر انسان کے لئے ہے۔ لہٰذا رحمتوں کا سب سے زیادہ مستحق بھی انسان ہی ہے اور بدترین عذاب کا مستوجب بھی آدمی ہی ہے اسی لئے بزرگانِ دین خوف سے کہا کرتے تھے کاش میں گھاس ہوتا، کاش میں پتھر ہوتا۔ بعض بزرگ پرند کو دیکھ کر کہا کرتے تھے تو کتنا خوش نصیب ہے کہ تجھکو کوئی عذاب نہیں۔ "کاش میں گھاس ہوتا" یہ حضرت ابوبکرؓ ہی کا قول ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ واقعی آدمی کو انسان بننا کس قدر مشکل ہے۔ اور انسان کو دوزخ سے نجات بلکہ حق سبحانہٗ کا قرب صرف اُس کی معرفت اور عبادت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے ورنہ پھر حیوان اور انسان میں کوئی فرق نہیں"۔

استعداد اور تکلیف

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

طور پہاڑ ہے، برق تجلّی اس چیز پر گرنی چاہیئے جس کو شعور ہو، چنانچہ جب تجلّی ہوئی تو پہاڑ کا سُرمہ ہو گیا مگر حضرت موسیٰؑ صرف بے ہوش ہوئے غالب کا یہ شعر اس آیت کی طرف اشارہ ہے "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ الخ ... پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے "ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمین، اور پہاڑوں پر پیش کی مگر انھوں نے انکار کر دیا اور ڈر گئے البتہ انسان نے اس امانت کو اٹھا لیا۔"

حافظ شیرازیؒ نے بھی اس آیت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے مشہور شعر میں پیش کیا ہے ؎

آسماں بارِ امانت نہ توانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

آسمان امانت کے بوجھ کو نہ اُٹھا سکا، لیکن انسان نے اس بارِ عظیم کو اٹھا لیا۔

"امانت" اس جگہ بڑا اہم گہرا اور بامعنی لفظ حق سبحانہٗ نے استعمال کیا ہے۔ امانت کے معنی ہیں" "یعنی خداوند کریم کے احکامات پر عمل کرنے کی استعداد انسان کے سوا کسی اور مخلوق میں نہیں خواہ وہ آسمان ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے پیش

کرنے سے کوئی یہ تصور نہ کرے کہ فی الواقع خدا نے آسمانوں، زمین اور پہاڑ سے کہا ہوگا کہ اس کو اٹھاؤ مگر انھوں نے انکار کر دیا اور وہ ڈر گئے۔ حق تعالیٰ نے قرآن میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے ہیں۔" دراصل ایک زبانِ قال ہوتی ہے اور دوسری زبانِ حال۔ زبانِ قال تو بولنے والی زبان کو کہتے ہیں لیکن "زبانِ حال" اس زبان کو کہتے ہیں جس کی حالت دیکھ کر ہی اس کے جواب کا اندازہ لگایا جا سکے۔ مثلاً حیوان اور انسان کے دانت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ چبانے یا کاٹنے کے لئے ہیں۔ پانی زبانِ حال سے کہتا ہے میں پینے، دھونے، نہانے اور سیراب کرنے کے لئے ہوں۔ آگ زبانِ حال سے کہتی ہے میں جلانے، کھانا پکانے اور چاندی سونا وغیرہ پگھلانے کیلئے ہوں۔"

اسی لئے خداوندکریم نے فرمایا ہے "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" اللہ نے کسی نفس کو اس کی صلاحیت سے زیادہ تکلیف نہیں دی۔ مثلاً چوپایوں کو عبادت اور معرفت کا حکم نہیں دیا۔ اس موقع پر ہم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ"[۴۸] سے اقتباس پیش کرتے ہیں:-

"امام غزالیؒ اور بیضاویؒ وغیرہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ یہاں امانت سے مُراد عہدۂ تکلیف ہے جو کہ آسمان اور زمین کے آگے پیش کیا گیا اور جس کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ کی عبادت کرنے سے ثواب اور اس کی معصیت کرنے سے عذاب ملتا ہے اور اُن کے آگے پیش کرنے سے ان کی استعداد اور قابلیت کا اندازہ لگانا مراد ہے کہ وہ اس کو سرانجام دے سکتے ہیں یا نہیں۔ ان کے

انکار کرنے سے ان کی عدم لیاقتی اور لااستعدادی مراد ہے یعنی وہ اس کو سرانجام نہیں دے سکتے۔ اور انسان کے اٹھانے سے اس کی لیاقت اور استعداد مراد ہے۔ اور اب میں (شاہ صاحبؒ) کہتا ہوں کہ اس تقدیر پر خداوند تعالیٰ کا یہ قول کہ "انسان ظالم اور جفاکار جاہل (ظَلُوْمًا جَهُوْلًا) تھا" اس کی استعداد کی علت بیان کر رہا ہے یعنی ظالم وہ ہوتا ہے کہ عادل نہ ہو لیکن اس میں عدل کی لیاقت ہو۔ اسی طرح جاہل وہ ہوتا ہے کہ جو جانتا نہ ہو لیکن اس میں جاننے کی لیاقت ہو، چنانچہ سوائے انسان کے اور جتنی مخلوق ہے یا تو وہ محض عالم و عادل ہے کہ ظلم و جہل کی وہاں رسائی ہی نہیں جیسے فرشتے ؑ یا وہ محض ظالم و جاہل ہیں جیسے چوپائے کہ ان میں علم اور عدل کی لیاقت ہی نہیں۔ لہذا امانت یا تکلیف کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جس میں کمال بالقوۃ ہو بالفعل نہ ہو (یعنی کسبی ہو فطری نہ ہو)۔ اس آیت میں جو "لِیُعَذِّبَ" کا لفظ ہے اس میں "لام عاقبۃ" ہے یعنی امانت اٹھانے کا انجام یا راحت (جنت) ہے، یا رنج (دوزخ)۔ یعنی انسان کو اپنے عقیدہ اور عمل کے نتیجے میں یا تو جنت نعیم ملتی ہے یا نار جحیم ؑ۔

آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ جس مخلوق کے ایک ایک قول اور فعل پر جنت یا دوزخ ملتی ہو اس کی اہمیت خالق کے نزدیک کتنی ہے!

انسان کی خلقت پر ایک مرتبہ اور غور کیجئے، پہلے اس کے جسم میں لچک پیدا کی پھر نماز کا حکم دیا۔ پہلے اس میں بھوک پیاس پیدا کی پھر روزہ کا حکم دیا۔ چلنے پھرنے، سفر کرنے کی صلاحیت پیدا کی پھر حج کے احکام نازل کئے۔ کمانے اور روزی

پیدا کرنے کی استعداد رکھی اس کے بعد زکوٰۃ فرض کی۔ بازو میں زور اور دل میں شجاعت پیدا کی اس کے بعد جہاد کا حکم دیا۔ عقل پیدا کی پھر عبادت اور معرفتِ الٰہی کا مکلّف کیا۔ جتنے بھی شریعت کے احکام ہیں وہ سب "ظرفِ قدح خوار" ہی دیکھ کر نازل کئے گئے ہیں۔ دُنیا میں انسان برقِ تجلّی کی تاب نہ لا سکے مگر جنت میں تاب لا سکے گا۔ انسان دنیا میں معرفت اور عبادت سے اس قابل بنتا ہے کہ جنّت میں رہنے کا شعور پیدا ہو جائے۔ ہر ایک کو یہ دولت نصیب نہیں ہوتی ع

این دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

استعداد بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی، رہنمائی بھی انھوں نے کی، ہدایت کا راستہ بھی انھوں نے ہی آسان کیا، اور پھر جنّت میں وہی لے جاتے ہیں، گناہوں سے بچا کر، معاف کر کے۔ ان کی عنایتیں انسان پر بے شمار ہیں، انسان خود بھی غور کر کے ان عنایتوں کا احساس کر سکتا ہے۔ قرآن میں سرتا سر اسی کی تعلیم ہے، "کیوں غور نہیں کرتے، اپنے نفسوں اور آفاق میں غور کرو، ایک ایک چیز میں حق سبحانہٗ کی جلوہ گری دیکھو گے" اور اس کی حکمتوں کا تماشا کرو گے۔"



گُناہ

درِیائے معاصی تنک آبی سے ہُوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہُوا تھا

یہ وہ مشہور شعر ہے کہ جس کو پڑھ کر ذوق پہروں سر دُھنا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "غالب کو اپنے اچھے شعروں کی خود بھی خبر نہیں ہوتی"۔ ہم نے "گناہ" کا عنوان ارادتاً "خیر و شر" کے بعد رکھا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ خیر "وجود" ہے اور شر "عدم" ہے۔ حق سبحانہٗ کی یہ حکمت بالغہ ہے کہ وہ خیر کو باقی رکھنے اور شر کو فنا کرنے کی طرف مائل ہے۔ بیماری کے جراثیم شیشہ کے ٹکڑے پر رکھ دو تو وہ چوبیس ۲۴ گھنٹے زندہ رہیں گے، لیکن ان کو انسان کی ہتھیلی پر رکھ دو تو ایک منٹ کے اندر تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کے اندر مدافعت کا مادّہ موجود ہے۔ مومن گناہ کرے ایمان کے تقاضے سے یا تو اس کا اثر ہی نہ ہو گا یا معاف کر دیا جائے گا یعنی توبہ سے۔

غالب کہتے ہیں کہ میں دریائے معاصی میں غرق ہونا چاہتا تھا لیکن میرا سرِ دامن بھی تر نہ ہُوا تھا کہ دریائے معاصی خشک ہو گیا۔

حق سبحانہٗ گناہوں کو بہت معاف کرتے ہیں وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ یعنی وہ بہت سے گناہ تو معاف ہی کر دیتا ہے۔ ہر نیکی سے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتا ہے

اور توبہ سے بڑے سے بڑا گناہ بھی معاف کر دیا جائے گا۔ حدیث صحیح ہے التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ یعنی جس شخص نے گناہ سے توبہ کر لی گویا اُس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ گناہ معمولی بات ہے۔ گناہ کرنے سے (حدیث کے مطابق) دل یا رُوح میں سیاہ نقطے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اگر انسان نیکی کرتا ہے تو وہ نقطہ مِٹ جاتا ہے ورنہ دِل زنگ آلود ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ دل پر مہر لگ جاتی ہے اور پھر ہدایت قبول کرنے کی استعداد ہی نہیں رہتی۔ اس نکتہ کو سمجھ لیجئے۔

غالب کا ایک مشہور شعر ہے ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

عام طور پر اس شعر کی تشریح شارحین نے اس طرح کی ہے کہ جب خدا قیامت میں غالب سے حساب لے گا تو وہ اپنے رب سے کہیں گے کہ میرے گناہوں کا حساب نہ مانگیئے کیونکہ مجھے وہ حسرتیں یاد آگئی ہیں جو گناہ کرنے کی میرے دل میں باقی رہ گئی ہیں۔" شوخی تو اور بات ہے لیکن حقیقت سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔ قیامت کا دن ہولناک دن ہے، اُس دن غالب بیچارے کی کیا ہمت ہوگی کہ وہ خداوند ذوالجلال کے سامنے ایسی جسارت کر سکے کہ لاتعداد گناہ تو میں کر ہی چکا مگر اور بھی حسرتیں باقی ہیں۔ غالب بہت مشکل پسند شاعر ہیں ان کے شعر کا مطلب اتنا آسان ہو ہی نہیں سکتا۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ قرآن و حدیث کا مطلب اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں مگر اپنے خاص انداز میں۔ در اصل ایک حدیث ہے کہ بعض مومن ایسے

بھی ہوں گے کہ جو اپنا نامۂ اعمال پڑھیں گے تو ان کو گناہ بہت نظر آئیں گے۔ اس کے بعد گھبراہٹ میں دوبارہ پڑھیں گے تو ان کو گناہوں کی جگہ نیکیاں لکھی نظر آئیں گی۔ تو مومن خداوند سبحانہٗ کی اس عنایت کو دیکھ کر کہے گا کہ میرے اور بھی گناہ لکھنے سے رہ گئے ہیں تاکہ ان کی بجائے بھی نیکیاں مل جائیں۔

غالب یہی بات کہنا چاہتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ میں جب اپنے نامۂ اعمال میں گناہ لکھے ہوئے دیکھوں گا اور پھر ان کی بجائے نیکیاں درج کی ہوئی نظر آئیں گی تو رب رحیم سے عرض کروں گا کہ میرے اُن گناہوں کی حسرتیں بھی درج ہو جائیں جو بعض موانع کی وجہ سے میں دُنیا میں نہ کر سکا تھا۔ اب یہ جسارت نہیں رہی بلکہ رحمت کی طلب بن گئی۔ اور غالب یہی بات کہنا چاہتے ہیں۔ قرآن میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی بُرائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا۔"

ایک اور نازک مسئلہ ہے جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کبیرہ گناہوں سے مومن کافر ہو جاتا ہے یا نہیں؟ معتزلہ اور خارجی وغیرہ کہتے ہیں کہ ہو جاتا ہے، مُرجیہ ایک فرقہ ہے وہ اس کے برعکس عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان اگر مومن ہے تو کوئی گناہ اس کو نقصان نہیں پہونچا سکتا مگر یہ دونوں عقیدے قرآن اور اہل سنّت والجماعت کے عقائد کے خلاف ہیں۔ دراصل بعض فرقے انسانوں کی ایجاد ہیں۔ قرآن و حدیث کے مطابق عمل ہونا چاہئے نام کچھ ہی رکھ لو۔ قرآن میں ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ" پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر اور شرک تو معاف نہیں کرے گا البتہ

اس کے علاوہ اور گناہوں کو معاف کر دیگا جس کو چاہے گا"۔ یعنی جس مسلمان کو معاف کرنا چاہے گا۔ بس یہ آیت ہی بنیاد ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفر اور شرک قابل معافی نہیں۔ اور گناہ خواہ صغیرہ ہوں خواہ کبیرہ معاف ہو سکتے ہیں اور ان کے کرنے سے کافر نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی حکمت سے بعید ہے کہ وہ صاحب کبیرہ سے بھی وہی معاملہ کرتے جو کافر سے کرتا ہے (حجۃ البالغہ)

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ میری امت میں تہتر[۷۳] فرقے ہو جائیں گے ان میں سے صرف ایک جنتی ہے باقی سب دوزخی ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی سب فرقے کافر ہو گئے بلکہ وہ بقدر گناہوں اور بدعتوں کے دوزخ میں جائیں گے لیکن ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہیں گے کیونکہ وہ گنہگار ہیں کافر نہیں ہیں"۔ اور قرآن کی رُو سے یہ مطلب بالکل صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والے ہیں، معمولی بہانہ سے معاف کر دیتے ہیں۔ مگر جو گناہوں پر اَڑ جائے اس کا کیا علاج۔ زہر تو اپنا اثر ضرور کرے گا حکیم کے بتلانے یا منع کرنے سے نہیں بلکہ زہر کھانے کا لازمی نتیجہ ہلاکت ہے جو اس سے منفک نہیں ہو سکتا۔ "کفر و ایمان" پر مفصل بحث آگے آئے گی۔

اب ہم اس اہم مسئلہ پر دوسرے پہلو سے بحث کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ کافر اور گنہگار مزے کرتے پھرتے ہیں ان کو خدا دنیا میں کوئی سزا نہیں دیتا۔ اگر دنیا میں واقعی ایسا سسٹم ہوتا کہ گنہگار کو گناہ کے بعد فوراً سزا مل جایا کرتی تو کوئی آدمی خوف کی وجہ سے گناہ ہی نہ کرتا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے الفاظ یہ ہیں "مردم بالطبع راہ نیکی گیرند" یعنی اگر فوراً سزا مل جایا کرے تو لوگ بالطبع (فطری طور پر) نیکی ہی کرنے لگیں کوئی گناہ ہی نہ کرے"۔ دنیا اور آخرت کا جو رابطہ ہے اور دوزخ

اور جنت کا جو وجود ہے یہ سب نظام بیکار ہو جائے۔ پھر بھی اکثر لوگوں کو اس سے دل چسپی ہے کہ نیکی کا کچھ بدلہ دنیا میں بھی مل جائے اور بدی کی سزا بدوں کو مل جائے۔ مگر ایسا کہنے والوں کو یہ خیال نہیں رہتا کہ ان میں بھی بہت برائیاں ہیں۔ اگر ان کی سزا ملنے لگے تو ان کو زندگی گذارنا ہی دوبھر ہو جائے۔ بلاشبہ بعض افراد کے لئے مصلحتاً ایسا ہوتا ہے کہ ان کو تنبیہ کے لئے کچھ سزا دنیا میں دی جائے مگر خدائے حکیم مصلحت کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں، اس کا اندازہ انسان کے جسم کی بناوٹ سے کیجئے، جتنی خوبصورت چیز ہے وہ سامنے ہے۔ پاخانہ، پیشاب، ناک اور کان کا میل وغیرہ چیزیں چھپی ہوئی ہیں۔ مگر ان کا وجود بھی ضروری ہے۔ انسانی زندگی کے لئے ایسا ہونا لازمی تھا۔ اسی طرح جس کے لئے دنیوی سزا ضروری ہوتی ہے وہ ملتی ہے ورنہ ملتوی رہتی ہے۔" اس نکتہ کی وضاحت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے خوب کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"خارجی (یعنی دنیوی) جزا و سزا کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ وہ اسباب کے فراہم ہونے پر ملتی ہے، پس جو کوئی اس بات کو سمجھ لے اور اسباب سے جو نظام ظہور میں آیا ہے اس کو مدنظر رکھے تو وہ قطعی طور پر جان لے گا کہ خداوند تعالیٰ کسی گنہ گار اور نافرمان کو دنیا میں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ نظام کائنات کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب انسان کو راحت و آرام دینے یا رنج و عذاب دینے کے ظاہری اسباب موقوف ہو جاتے ہیں تو اس کو نیک اعمال کے ذریعہ راحت و آرام دیا جاتا ہے یا اعمال بد کے ذریعہ رنج و عذاب دیا جاتا ہے اور جب کسی انسان کے لئے رنج و عذاب

کے اسباب جمع ہوجاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ شخص ہوتا نیکوکار ہے تو اگران اسباب کا بند کرنا اُس کی نیکوکاری کے مقابلہ میں کچھ بڑا بھی نہیں ہوتا تو اُس کے نیک اعمال اُس بلا و مصیبت کو سرے سے دفع کرنے میں، اور اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو اُس کی سختی قدرے کم کرنے میں صرف کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی کے لئے اسباب تو راحت و آرام کے جمع ہوجاتے ہیں لیکن وہ شخص بدکار ہوتا ہے تو اُس کے اعمال بد اُس نعمت و آرام کے دُور کرنے میں صرف ہوجاتے ہیں، اگر اُس کے اعمال کے موافق اسباب جمع ہوجاتے ہیں تو اُس وقت راحت بھی خوب ملتی ہے اور تکلیف و سزا بھی خوب ملتی ہے لیکن کبھی اعمال کی دنیوی سزا یا جزا ملنے سے نظام کائنات کی مصلحت ضروری ہوتی ہے تو ایسے موقع پر بدکار کو تو نعمت و آرام دے کر کچھ عرصہ مہلت دیدی جاتی ہے اور نیکوکار کو ظاہری طور پر تنگی اور مصیبت میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ تنگی اُس کی قوت بہیمیہ کے توڑنے میں صرف کی جاتی ہے اور مومن اُس پر راضی ہوجاتا ہے، جیسے کوئی شخص کڑوی دوا کو اُس کے فائدے کے پیش نظر خوشی خوشی پی لیتا ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول صفحہ ۶۹)

اب ہم اُس کی وضاحت کرتے ہیں کہ بلا شبہ بعض گناہوں کی سزا اور بعض نیکیوں کی جزا دُنیا میں بھی مل جاتی ہے مگر اکثر لوگ محسوس نہیں کرتے اور جن کو خدا نے دیدۂ عبرت نگاہ اور گوشِ حقیقت نیوش دیے ہیں وہ محسوس بھی کرتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جو نظام عالم کی مصلحت کا لفظ لکھا ہے اُس کا مطلب یہ ہے

مثلاً کوئی شخص انتہائی گنہ گار ہے اس کو دنیوی سزا بھی ملنا ضروری تھی، مگر اس کے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں یا ماں باپ ضعیف ہیں یا چند کمزور اور مفلس لوگوں کی روزی اس سے وابستہ ہے اس لئے اللہ حکیم اس کا زندہ و تندرست رکھنا یا بلاؤں سے محفوظ رکھنا ضروری سمجھتا ہے، لہٰذا وہ محفوظ رہے گا۔ نیک آدمی کو بعض بلاؤں سے اسی طرح محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اس موقع کے لئے غالب نے نہایت نفیس شعر کہا ہے ؎

بندہٗ را کہ بہ فرمانِ خدا راہ رود ۔۔۔ نہ گذارند کہ در بند زلیخا باشد

یعنی جو بندہ حضرت یوسفؑ کی طرح اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گذارے گا پھر ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ اس کو زلیخا کی قید میں چھوڑ دے۔ دنیوی سزا و جزا کا راز یہ ہے کہ جو شخص اللہ سے محبت رکھتا ہے اس کو دنیوی تکلیف، رنج و بیماری اس شخص کے مقابلہ میں بہت کم محسوس ہوتی ہے جس نے حق سے رابطہ توڑ رکھا ہو۔ اس میں راز یہ ہے کہ اللہ کی محبت کی وجہ سے دل پر ہر وقت ایک طرح کی مسرت طاری رہتی ہے۔ اسی وجہ سے فرقۂ مرجیہ کے علماء کو غلط فہمی ہوئی ہے اور انھوں نے کہدیا کہ گناہ مومن کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔ اور صرف ایمان خالِص کافی ہے۔ فرقہ معتزلہ (جس کے ہم خیال آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں پائے جاتے ہیں) کا خیال ہے کہ گناہ کبیرہ سے انسان کافر ہوجاتا ہے۔ معتزلہ اور خوارج کے سامنے یہ حدیث تھی "چوری اور زنا مومن نہیں کیا کرتا"۔ انھوں نے اس کا مطلب یہ نکال لیا کہ جو شخص زنا اور چوری یا کوئی اور گناہ کبیرہ کرے وہ مومن نہیں رہتا۔ حالانکہ ہماری زبان میں بھی محاورہ ہے کہ "تو مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جھوٹ بولنے سے تو اب مسلمان نہیں رہا بلکہ اِس

محاورے کے معنی یہ ہیں کہ جھوٹ بولنا (یا کوئی اور گناہ کبیرہ کرنا) مسلمان کی شان کے شایان نہیں ہے ۔

ایک واقعہ حضورؐ کے سامنے ہوا۔ ایک صحابی کو شراب پینے پر کئی مرتبہ کوڑے مارے گئے، غالباً تیسری مرتبہ خالد ابن ولیدؓ نے کہا " لعنت تجھ پر کہ تو سزا پا رہا ہے مگر مے نوشی نہیں چھوڑتا"، حضورؐ نے فرمایا " اس کو لعنت مت کرو، یہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے " اس سے ہی اہل سنت والجماعت نے یہ اصول استنباط کیا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کسی مومن سے گناہ (خواہ کبیرہ ہی ہو) سرزد ہو اور وہ اللہ اور رسولؐ سے محبت رکھتا ہو یعنی بشریت کے تقاضے سے سرزد ہو سکتا ہے لیکن اس کا ایمان نہیں جائے گا، ہم اس کو صرف گنہ گار کہہ سکتے ہیں۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ گناہ معاف کرنا اللہ کے نزدیک کچھ مشکل نہیں مگر یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں ایمان نہ چلا جائے"۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے ع

ایماں اگر بہ قبر بری صد کرامت است

یعنی اگر تو ایمان قبر تک سلامت لے جائے تو سمجھ لے کہ سو کرامتیں تجھے حاصل ہیں۔ ••

ایمان اور کفر

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا
مومن نہ بود غالب و کافر نہ تواں گفت

اگرچہ غالب نے یہ شعر شوخی میں کہا ہے مگر اس نے پڑھنے والے کے دل و دماغ کو ایک اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ مطلب اس شعر کا تو یہ ہے کہ ہمیں غالب جیسے شیفتہ سے واسطہ پڑ گیا ہے جو حقیقی معنوں میں مومن بھی نہیں اور اس کو کافر بھی نہیں کہہ سکتے۔ دیکھئے غالب نے یہ نہیں کہا کہ "کافر نہ بود غالب و مومن نہ تواں گفت" کیونکہ کسی مومن کو یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سچا مومن نہیں مگر اس کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ یعنی کسی مسلمان کو کافر نہیں کہنا چاہیئے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو ایمان لانے کا حق ہے اس طرح ایمان لاؤ۔ قرآن میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا الخ یعنی اے ایمان والو! ایسا ایمان رکھو جو اس کا حق ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اے مسلمانو! تم ایمان نہیں لائے اب ایمان لاؤ۔ کیونکہ ایمان یقینی چیز ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں مومن ہوں تو یقین کر لو کہ وہ مومن ہے، دل کو چیر کر کوئی دیکھ نہیں سکتا۔

بہرکیف ایمان اور اسلام بہت صاف اور واضح چیزیں ہیں۔ مگر افسوس ہے

کہ ایمان وکفر کو ہی ہم نے بازیچۂ اطفال بنالیا ہے، جاہلوں کو چھوڑ یئے، اکثر علماء دوسروں کو معمولی باتوں پر کافر قرار دیدیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن اصل چیز ہے۔ اور نصِ قطعی ہے، اس میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ یعنی اللہ شرک اور کفر کو معاف نہیں کرے گا اور اس کے سِوا اور گناہوں کو جس کو بھی چاہے گا معاف کردے گا ——— ایمان اور اسلام میں کچھ فرق بھی ہے۔ ایمان اللہ، رسول، فرشتوں، کتابوں، قیامت، دوزخ، جنّت اور تقدیر کو دل سے ماننے کو کہتے ہیں، اور اسلام کلمہ طیبہ پڑھنے، نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، حج کرنے (اگر استطاعت ہو) اور زکوٰۃ دینے (اگر صاحب نصاب ہو) کو کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایمان تو رکھتا ہے مگر اسلام کے ارکان پر عمل کرنے میں سست ہے یا کسی ایک رُکن یا کئی ارکان کا تارک ہے تو قرآن وحدیث کی رُو سے وہ گنہگار مسلمان ہے، کافر نہیں ہے۔

مسلمانوں میں اعمال کے مسئلہ پر اختلاف ہوا ہے اور لاتعداد فرقے ہو گئے اگر ایک فرقہ صرف اپنے کو حق پر کہتا اور دوسرے کو غلط راستے پر کہتا مگر کافر نہ کہتا تو غنیمت تھا مگر ایک فرقہ نے دوسرے کو کافر کہنا شروع کر دیا مثال کے طور پر ہم ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک حدیث ہے کہ "جس نے نماز دیدہ و دانستہ چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا"۔ اس سے معتزلہ اور خوارج وغیرہ نے یہ مسئلہ استنباط کیا کہ کبیرہ گناہ سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اعمال بھی جزوِ ایمان ہیں۔ امام اعظمؒ اور شاہ ولی اللہؒ وغیرہ کے نزدیک اعمال جزوِ ایمان نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس عقیدہ کی تائید میں کہ اعمال جزوِ ایمان نہیں، قرآن کا حوالہ دیا ہے

اور فرمایا ہے کہ قرآن میں ہر جگہ "آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" آیا ہے۔ واو حرف عطف ہے اور یہ اس جگہ آتا ہے جہاں دو جداگانہ چیزیں ہوں۔ مثلاً سفید اور سیاہ، بھائی اور بہن، زید اور بکر وغیرہ۔ لہٰذا ایمان اور چیز ہے اور عمل دوسری چیز ہے۔ صحابہ کے زمانہ میں ایک مسلمان نے دوسرے کو کافر نہیں کہا بعد میں جب مسلمانوں میں فلسفہ پھیلنے لگا اور ایران کے لوگ مسلمان ہونے لگے، ہر مسئلہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا تو اختلافات پیدا ہوتے گئے۔ پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ ایک ایک مسئلہ پر ایک ایک فرقہ الگ پیدا ہوتا گیا۔ ایک نے کہا "خدا جسم سے پاک ہے وہ منزہ ہے"۔ مشبّہ فرقہ نے کہا "خدا جسم رکھتا ہے"۔ اس نے قرآن کی اس آیت کا حوالہ دیا کہ "خدا نے عرش پر قرار پکڑا"۔ ایک جگہ قرآن میں "یَدُ اللّٰہ" آیا ہے اس کے معنی ہیں "خدا کا ہاتھ ہے"۔ مجسّمہ فرقہ نے یہ مطلب نکالا کہ خدا کے بھی انسان کی طرح ہاتھ پاؤں سر وغیرہ ہیں۔ پھر "خلقِ قرآن" کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ یعنی یہ کہ قرآن بھی اور چیزوں کی طرح مخلوق ہے۔ دوسرے فرقہ نے خصوصاً امام احمد بن حنبلؒ نے کہا کہ "مخلوق" نہیں، اللہ کا کلام ہے، کلام، اللہ کی صفت ہے اللہ کی ساری صفات قدیم ہیں، لہٰذا قرآن بھی قدیم اور غیر مخلوق ہے۔ اب متاخرین علماء کا اس پر اتفاق ہو گیا ہے "کلام نفسی یعنی مضمون قدیم ہے صرف حرف مخلوق ہیں۔ ورنہ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ مخالفوں نے قتل و خون کا بازار گرم کر دیا تھا۔ بغداد کے محلّے کے محلّے اجڑ گئے تھے۔ افسوس کا مقام ہے کہ آج ہمارے دور میں بھی تکفیر کا بازار گرم ہے ایک فرقہ دوسرے کو کافر ورنہ کم از کم بدعتی تو ضرور کہتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ ایمان بہت اہم بلکہ انمول چیز ہے۔ کسی کو کافر کہنے سے احتراز کرنا چاہیئے اور اللہ کے سپرد کرنا چاہیئے۔ وہی دل کا حال جانتے ہیں سم

سے قیامت میں ہمارے ایمان اور اعمال کا سوال ہوگا دوسروں کے عقائد اور اعمال کا نہیں "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ" جو کچھ دوسروں نے کیا وہ بھگتیں گے جو تم کرو گے تم بھگتو گے"۔ تم سے دوسروں کے متعلق نہیں پوچھا جائیگا

امام غزالیؒ کا زمانہ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا مگر فرقے بھی لاتعداد ہو گئے تھے قریب قریب ایسی ہی حالت تھی جیسی ہمارے دور میں ہے ہر فرقہ اپنے کو حق پر اور دوسرے کو گمراہ تصور کرتا ہے۔ امام غزالیؒ کے زمانہ میں اشعریہ، ماتریدیہ حنبلیہ، مجسمہ، مشبہ، رافضی، خارجی، باطنیہ، مرجیہ، جہمیہ، قدریہ، جبریہ، معتزلہ فرقے بہت مشہور تھے۔ امام موصوف نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "اَلتَّفْرِقَةُ بَيْنَ الْاِسْلَامِ وَالزَّنْدَقَةِ" یہ دراصل ایک دوست کے نام ان کا خط ہے، اس میں امت کے اختلاف اور ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ کے گمراہ کہنے پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم اس عبارت کو من وعن نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین حقیقت تک پہونچ سکیں، امام صاحب لکھتے ہیں :۔

"جس شخص کا یہ خیال ہے کہ اشاعرہ، یا معتزلہ، یا حنبلیہ اور دیگر فرقوں کی مخالفت کفر ہے تو سمجھ لو کہ وہ اندھا مقلد ہے اس کی اصلاح کی کوشش میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ جو شخص اشعریہ کی مخالفت کو کفر خیال کرتا ہے اور اس بنا پر علامہ باقلانی کو کافر کہتا ہے اس سے پوچھنا چاہیئے کہ اشعری اور باقلانی اگر باہم مخالف ہیں تو باقلانی کے کفر کو اشعری کے کفر پر کیوں ترجیح ہے؟ اس کا برعکس کیوں نہ ہو؟ اگر باقلانی کی مخالفت جائز ہے تو کرابیسی اور قلانسی کی مخالفت کیوں جائز نہیں؟ اگر وہ شخص کہے کہ معتزلہ کا یہ عقیدہ

عقل میں نہیں آسکتا کہ خدا کی ذات ہی تمام صفات کے بجائے کافی ہے تو اُس سے پوچھنا چاہیے کہ اشعری کا یہ عقیدہ کیونکر قیاس میں آسکتا ہے کہ کلام الٰہی میں کثرت نہیں اور پھر وہ امر بھی ہے اور نہی بھی، خبر بھی ہے اور استخبار بھی، قرآن بھی ہے اور انجیل بھی، توراۃ بھی ہے اور زبور بھی"۔

اگر تم انصاف کرو تو معلوم ہوگا کہ جو شخص حق کو کسی خاص شخص میں محدود سمجھتا ہے وہ خود کفر کے قریب ہے کیونکہ اُس نے اُس شخص کو رسول اللہ صلعم کی طرح معصوم قرار دیا۔ غالباً تم کو کفر کے معیار کو جاننے کی خواہش ہوگی، تو میں ایک قاعدہ کلیہ بتاتا ہوں، کفر کے معنی صرف یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی جائے اُس چیز میں جو اُن پر خدا کی طرف سے آئی، لیکن اس میں یہ دشواری پیش آئیگی کہ مسلمانوں میں سے ہر فرقہ دوسرے فرقہ پر یہی الزام لگاتا ہے۔ اشعری معتزلہ کو اس لئے کافر کہتے ہیں کہ معتزلہ احادیثِ رویت کو تسلیم نہیں کرتے اور اس طرح رسول اللہ کی تکذیب کرتے ہیں"۔ معتزلہ، اشعری کی اس لئے تکفیر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک صفات الٰہی کی کثرت کا قائل ہونا "توحید باری" کے خلاف ہے اور رسول اللہ کی تکذیب ہے اِس مشکل کے حل کے لئے میں تم کو تصدیق و تکذیب کی حقیقت بتاتا ہوں:۔

"تصدیق کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جس چیز کے وجود کی خبر دی ہے اس کے وجود کو تسلیم کیا جائے لیکن وجود کے پانچ مدارج ہیں اور انھیں مدارج سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی تکذیب کرتا ہے۔ اس لئے میں ان مدارجِ خمسہ کی تفصیل کرتا ہوں۔

(۱)۔ وجود ذاتی یعنی وجود خارجی۔

(۲)۔ وجودِ حسّی: یعنی صرف حاسّہ میں موجود ہونا، مثلاً خواب میں ہم جن اشیاء کو دیکھتے ہیں ان کا وجود صرف ہمارے حاسّہ میں ہوتا ہے یا جس طرح بیماروں کو جلنے کی حالت میں خیالی صورتیں نظر آتی ہیں یا شعلۂ جوّالہ کا دائرہ جو در حقیقت دائرہ نہیں لیکن ہم کو دائرہ نظر آتا ہے۔

(۳)۔ وجود خیالی:۔ مثلاً زید کو ہم نے دیکھا، پھر آنکھیں بند کرلیں تو زید کی صورت جو اب ہماری آنکھوں میں پھرتی ہے، یہ وجودِ خیالی ہے۔

(۴)۔ وجودِ عقلی: یعنی کسی شے کی اصلی حقیقت، مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ یہ چیز ہمارے ہاتھ میں ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہماری قدرت اور اختیار میں ہے تو قدرت اور اختیار ہاتھ کا وجود عقلی ہے

(۵)۔ وجودِ شبہی۔ یعنی وہ شے خود موجود نہیں، لیکن اس کے مشابہ ایک چیز موجود ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن موت مینڈھے کی شکل میں لائی جائیگی اور ذبح کردی جائیگی۔ یہ امام صاحب کے نزدیک وجودِ حسّی ہے، یا ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا " میں یونسؑ کو دیکھ رہا ہوں .. الخ یہ وجود خیالی ہے "

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ شریعت میں جن جن چیزوں کا ذکر آیا ہے اُن کے وجود کا مطلقاً انکار کرنا کفر ہے ، اگر اقسام مذکورہ بالا میں سے کسی ایک قسم کے مطابق اس کا وجود تسلیم کیا جائے تو یہ کفر نہیں ہے کیونکہ یہ تاویل ہے اور تاویل سے کسی فرقہ کو مفر نہیں " احادیث میں آیا ہے کہ قیامت میں اعمال تولے جائیں گے ، چونکہ اعمال عرض ہیں (یعنی جسم نہیں) اس لئے وہ تولے نہیں جا سکتے ، اس لئے سب فرقوں کو تاویل کرنی پڑی ، اشاعرہ کہتے ہیں کہ نامۂ اعمال کے کاغذ تولے جائیں گے ، معتزلہ کہتے ہیں کہ تولنے سے انکشافِ حقیقت مراد ہے امام صاحب نے اس پر زور دے کر کہا ہے " جو یہ کہتا ہے کہ نفسِ اعمال ، جو عرض ہیں وہی تولے جائیں گے اور اُنھیں میں وزن پیدا ہو جائے گا وہ سخت جاہل ہے " (الغزالی ص۱۲۸)

امام غزالیؒ کے نزدیک تاویل سے کافر نہیں ہوتا ، صاف انکار کرنے سے کافر ہوتا ہے مثلاً قرآن میں ہے " رحمٰن نے عرش پر قرار پکڑا " ایک فرقے نے کہا کہ خدا عرش پر اس طرح ہے جس طرح بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے ۔ دوسرے فرقے نے کہا " یہ خیال غلط ہے ، خدا انسان کی طرح جسم نہیں رکھتا ہے ، لہذا عرش پر قرار پکڑنے سے مُراد حکومت ، تسلّط اور فرمانروائی ہے " ان تاویلات پر ایک فرقہ کا دوسرے کو کافر کہنا غلط ہے زیادہ سے زیادہ ایک فرقہ دوسرے کو بدعتی کہہ سکتا ہے ، اگرچہ یہ فیصلہ کرنا باقی ہے کہ حقیقت سے کون فرقہ قریب ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ دونوں فرقے مسلمان ہیں ..

دُعَاء

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دُعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مُدّعا نہ مانگ

مرزا غالب کی مشکل پسندی کے مطابق دُعا کے متعلق ان کا یہ انوکھا شعر ہے۔ دُعا کا شعر بہت سادہ اور صاف ہونا چاہیے تھا مگر وہ اتنے سکون سے بیٹھنے والے کہاں ہیں۔ جو شخص یہ دُعا کرتا ہو کہ ؎

یارب ز جنوں طرح غمے در نظرم ریز　　صد بادیہ در قالب دیوار و درم ریز

وہ سیدھی سادی دُعا کب مانگے گا؟۔

غالب مذکورہ شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر تجھ کو یہ یقین ہے کہ میری دُعا ضرور قبول ہوگی تو دُنیا کے لئے کوئی دُعا نہ مانگ، اگر شہنشاہ سے مانگنا ہی ہے تو ایسا دل مانگ جس میں سوائے اُس کی طلب کے کوئی مُدّعا نہ ہو۔

اس شعر کا یہ مطلب نہیں کہ دُعا مانگنی ہی نہ چاہیئے۔ غالب کا علم کس قدر وسیع تھا اس کا اندازہ اس کے لفظ "یقینِ اجابت" سے ہوتا ہے۔ ایک حدیث ہے اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ (خدا سے دُعا کیا کرو مگر قبولیت کا یقین رکھتے ہوئے)۔

امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "احیاء العلوم الدین" میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے لگے تو جبریلؑ آئے اور عرض کیا کہ میں آپ کی مدد کروں؟

انھوں نے جواب دیا "ھُوَ اَعلَمُ بِحَالِی" (وہ میرا حال خوب جانتے ہیں)
صاحب نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یوں کہنا کہ اللہ عزّوجل میر
حال کو جانتے ہیں سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ایک طرح کا سوال ہی ہے۔
ہر سوال زبانِ قال سے نہیں کیا جاتا ہے بعض سوال زبانِ حال سے بھی کئے جاتے
ہیں۔ کوئی مفلس پھٹے کپڑے پہنے ہوئے بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو جائے تو گویا
اس کی صورت ہی زبانِ حال سے سوال کر رہی ہے۔

حضرت شاہ بہلولؒ زبانِ قال سے سوال نہیں کیا کرتے تھے اور فرمایا
کرتے تھے کہ سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے دعا کی ضرورت ہی نہیں،
کیونکہ میں نے اپنی رضا کو محبوب کی رضا میں گم کر دیا ہے۔ یہ قول اُن کے حال کا
تقاضا تھا" یہ حال ہے اس پر کوئی گرفت بھی نہیں۔

قرآن میں دعا کرنے کا حکم ہے، دُعا کرنا فرض ہے "اُدعُونِی اَستَجِب
لَکُم" (مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا)۔ ایک حدیث ہے "اَلدُّعَاءُ
ھُوَ العِبَادَۃُ" (دعا عبادت ہی ہے) بہرحال دُعا مانگنی چاہیئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے
کہ دُعا ضرور قبول ہوتی ہے خدا کا وعدہ ہے۔ مگر یہ وعدہ مقید نہیں مطلق ہے۔ اس
کی مثال یہ ہے کہ ایک بندہ یہ دُعا مانگنے لگے کہ "یا اللہ میں آج ہی اور اسی
وقت بادشاہ ہو جاؤں" کیا اس طرح دُعا مانگنا جائز ہے، کیا اس طرح کی دُعا
قبول ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں" مقصد پورا ہونے پر تفصیلی بحث "تقدیر" کے
زیرِ عنوان دیکھئے" ہر شخص کی دُعا اس کے ظرف کے مطابق قبول ہوتی ہے۔ ایک
شخص دُعا کرتا ہے مگر وہ مقصد اس کے لئے مفید نہیں ہوتا اس لئے علیم وخبیر
اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں مولانا رومیؒ نے ایک نکتہ کی بات بتلائی

ما دعا کاں زیاں ست وہلاک   از کرم می نشنود یزدانِ پاک

یعنی جس دُعا کے قبول ہونے سے بندہ کو نقصان پہونچ سکتا ہو اس کو خدائے کریم قبول نہیں کرتے۔ اس کا راز یہ ہے کہ خدا کا علم بسیط ہے ازل سے ابد تک بندہ کی ساری زندگی خدا کے سامنے ہے وہ پیدا کرنے والا ہے، جانتا ہے کہ اس کی استعداد کتنی ہے، کیا وہ اس کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے اگر کسی کی دُعا قبول ہو جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ اس بندہ سے راضی ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی کتاب "بلاغ المبین" میں لکھتے ہیں "ہر کسے کہ دعائے او قبول شود، رضائے او تعالیٰ برائے او لازم نیست زیرا کہ خدائے تعالیٰ قبول کند دعائے مومن و کافر را" یعنی جس شخص کی دُعا قبول ہو جائے اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اُس سے راضی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ مومن و کافر دونوں کی دُعا قبول کرتا ہے

ہماری رائے میں غالب نے یہ شعر اس آیت سے متأثر ہو کر کہا ہے "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ" کیا اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں؟ مولانا رومیؒ نے بالکل یہی بات کہی ہے ؎

من نہ شادی خواہم و نے خسروی   انچہ می خواہم من از تو، ہم توئی

اے اللہ میں آپ سے نہ عیش چاہتا ہوں نہ بادشاہی، میں تو صرف آپ ہی کو آپ سے چاہتا ہوں"



عقل اور مذہب

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

اگر دیدۂ بینا کو قطرہ میں دریا، ذرّہ میں خورشید، اور جزو میں کُل نظر نہ آئے تو وہ دیدۂ بینا نہیں بلکہ بچوں کا کھیل ہے۔ یہ آسمان، زمین، سورج چاند، حیوان انسان، بحر و بر، پہاڑ، ابر و باد، اگرچہ ذاتِ پاک کے حجاب ہیں کائنات کے ذرّے نواہائے راز ہیں، سچ پوچھو تو ساز کے پردے ہیں۔ مگر آنکھ والے ان پردوں میں بھی ان کو دیکھ لیتے ہیں۔ اسی لئے ایک عارف نے کہا ہے مَارَاَیْتُ شَیْئًا اِلَّا رَاَیْتُ اللّٰہَ فِیْہِ (میں نے دُنیا کی جس چیز پر بھی نظر ڈالی اُس میں میں نے ذاتِ حق کا جلوہ دیکھا)۔ اسی پر غالب کو حیرت ہے حیران ہو کر کہتے ہیں ع

ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
ہیں

اگر کسی خوش نصیب کو دیدۂ بینا مل جائے تو وہ اس حقیقت سے مستفید … قوانین پر عمل

دیکھ سکتا ہے۔

جب انسان دنیا میں آتا ہے تو وہ ایک بے عقل و شعور بچہ ہوتا ہے اُس میں دیکھنے، چھونے اور سمجھنے کی قوتیں رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہیں۔ عاقل بن جانے کے بعد بھی دنیا کو سالہا سال تک ایک ہی طرز پر دیکھتا رہتا ہے۔ سورج نکلتا ہے، غروب ہوتا ہے، دن ہوتا ہے، رات ہوتی ہے، بچہ ماں کا دودھ پیتا ہے بڑا ہوتا ہے جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے، مرجاتا ہے، اشیاء فنا ہوتی ہیں پھر نئی پیدا ہوتی ہیں انسان فکر معاش اور دیگر افکار میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ اس کو کائنات اور کائنات کے خالق پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اگر دیدۂ بینا یہ احساس نہ کرے کہ انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جائے گا؟ اس غم کدہ میں اس کو کیوں محبوس کر دیا گیا ہے؟ اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ تو وہ دیدۂ بینا نہیں بلکہ اندھی آنکھ ہے۔ وہ فلسفی، جانور سے بھی بدتر ہے جو یہ کہے کہ دُنیا خود بخود پیدا ہوگئی ہے۔ خالق نے خود بلیغ انداز میں سوال کیا ہے أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا؟ کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ ہم نے تم کو فضول ہی پیدا کر دیا ہے؟ نہ تم سے باز پرس ہے؟ نہ ہمارے سامنے پیش ہونا ہے؟ نہیں! ہرگز ایسا نہیں ہے، ذرہ بھر نیکی کا بدلہ ملے گا اور ذرہ بھر برائی کا بدلہ ملے گا۔

دنیا کی ہر چیز انسان کی خدمت پر مامور ہے، سورج، چاند، سمندر، ابر و باد وغیرہ پھر انسان سے خالق کیا طلب کرتا ہے؟ شیخ سعدیؒ نے اس تصور کو خوب پیش کیا ہے

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند   تا تو نانے بہ کف آری و بہ غفلت نہ خوری

از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار   شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

ل کا اندھا ہی نابینا ہوتا ہے، آنکھوں کا اندھا، اندھا نہیں ہوتا، قرآن

نے فلسفیانہ انداز میں بتلایا ہے فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۝ یعنی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

مغرب کے فلاسفروں کی نظر جب قرآن پر پڑی اور اس پر غور کیا تو یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:۔

"معجزہ ناممکن الوقوع شے نہیں۔" (ہیوم)

"معجزہ انتہائی حیرت انگیز ہو سکتا ہے لیکن اس کو قبول کرنے کے لئے شہادت انتہائی قابل اعتبار ہونی چاہیئے۔" (ہکسلے)

"ہم کارخانۂ فطرت میں مداخلتِ خداوندی کے امکان کو باطل نہیں ٹھہرا سکتے، جس قوت نے کائناتِ مادی کو خلق کیا ہے، میرے نزدیک وہ اس میں حذف و اضافہ بھی کر سکتی ہے، اس قسم کے واقعات ایک طرح سے ہمارے لئے ناقابل تصور کہے جا سکتے ہیں مگر یہ اس سے زیادہ ناقابل تصور نہیں جتنا خود عالم کا وجود ہے۔"

(ولیم اسٹانلے جیونس)........ (سیرۃ النبیؐ جلد چہارم)

ہیگل قرآن پر غور کرنے کے بعد کہتا ہے:۔

"خدا انتہائی دانشمند ہے بلکہ اس کی دانش کی کوئی انتہا نہیں۔ جو دہریئے ہیں خدا کو نہیں مانتے ان کو لیڈروں اور رہنماؤں کے مجسموں اور قبروں کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم سے زیادہ کوئی دانشمند ہے اس کے آگے تم جھکتے ہو تو ان کے خالق کے آگے کیوں نہیں جھکتے۔؟"

ہیگل نے خدا کی دانش مندی کے کئی ثبوت دیئے ہیں۔ ایک جگہ لکھتا ہے:

"زمین لاکھوں میل کی دوری سے سورج کے گرد گھومتی ہے، گرمی میں کر ... ہیں ... قوانین پر عمل

آجاتی ہے، دُور ہو جاتی ہے تو سردی پیدا ہوتی ہے، جب کائنات خود بخود پیدا ہو گئی ہے تو سورج اور زمین ہزارہا سال گذرنے کے بعد بھی کسی دَور میں اتنے قریب کیوں نہیں آئے کہ ساری مخلوق جل کر فنا ہو جائے، کون اس کو تباہی سے روک لیتا ہے؟ میرے نزدیک وہی خدا ہے"

قرآن میں ایک جگہ انتباہ کیا گیا ہے" اگر اللہ کے سوا کوئی اور خدا ہوتا تو زمین و آسمان ٹکرا کر فنا ہو جاتے"

ہم دہریہ فلسفیوں سے سوال کرتے ہیں کہ جب کوئی خالق نہیں تو یہ عجیب و غریب کائنات ہے ہی کیوں؟ کیوں خود بخود پیدا ہو گئی؟ عالم میں یہ نظام کیوں پیدا ہو گیا؟ سیاروں میں کشش ہے کشش کیوں ہے؟ یہ کشش باطل کیوں نہیں ہوتی۔

آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ کر بعض مسلمان بھی کہتے ہیں" محمدؐ ریفارمر تھے" ان کے دماغ میں پیغمبر اور رسول کا کوئی تصور نہیں۔ قرآن پڑھتے ہیں مگر اس پر غور نہیں کرتے۔ رسول اکرمؐ نے کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا۔ تاریخ سے ثابت ہے۔ اَن پڑھ شخص خود (نعوذ باللہ) قرآن جیسی عبارت اور فلسفیانہ مضامین نہیں لکھ سکتا۔ ساری زندگی گویا قرآن کی تفسیر ہے، آپؐ کی ہزاروں حدیثیں ہیں، آپؐ کی فصاحت و بلاغت بھی مسلّم ہے مگر آپؐ کا عربی ادب قرآن کی ایک چھوٹی آیت سے نہیں ملتا۔ بہت فرق نظر آتا ہے۔ اگر (نعوذ باللہ) قرآن آپؐ کا بنایا ہوا ہوتا تو احادیث کا رنگ بھی یہی ہوتا۔ مخالفین یہاں خاموش ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے خدا کے احکام دو طرح کے ہوتے ہیں۔ تکوینی[1] اور تشریعی[2]۔ تکوینی احکام یہ ہیں، آگ سے جلنا، پانی سے آگ بجھنا، غسل کرنا، پیاس بجھنا، نمک ہونا، مرد کا عورت کی طرف، عورت کا مرد کی طرف رغبت کرنا،

اچھی بات سے دل خوش ہونا، جس کو انبساط کہتے ہیں۔ بری بات سے ناخوش ہونا، جس کو انقباض کہتے ہیں/ غذا کھانے سے بھوک مٹ جانا، جسم کو طاقت پہونچنا۔ مباشرت سے اولاد پیدا ہونا۔ جسمانی غذا کا زمین سے پیدا ہونا، روحانی غذا کا آسمان سے نازل ہونا، مثلاً قرآن کے احکام۔

۳۔ تشریعی احکام یہ ہیں :۔

وضو کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ پانی پہلے پیدا ہو چکا تھا، انسان کو نماز پڑھنے کا حکم اس لئے دیا کہ اس کے جسم میں لچک تھی وہ رکوع و سجود کر سکتا تھا/ روزہ میں بھوک پیاس پر صبر کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ انسان کے لئے بھوک پیاس پہلے ہی پیدا کر دی گئی تھی۔ انسان کو جہاد کرنے کا تشریعی حکم اس لئے دیا گیا کہ انسان میں جنگ کرنے کی استعداد دی گئی۔ دیکھ کر کام کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ پہلے آنکھیں عطا کر دی گئی تھیں۔ ہاتھوں کی بناوٹ ایسی رکھی کہ جس سے انسان ہر کام کر سکے۔ زکوٰۃ اور صدقہ کا حکم اس لئے دیا کہ انسان بسر اوقات کے لئے ضرور کماتا ہے غصہ کو روکنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ پہلے غصہ پیدا کر دیا گیا تھا۔ غرض ایک ایک چیز میں حکمت ہے انسان کہاں تک شمار کرے۔ تشریعی احکام کو ہی "تکلیف" کہتے ہیں تشریعی احکام، تکوینی احکام کے بعد نازل ہوتے ہیں، یعنی انسان کو اس وقت کسی کام کے لئے کہا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی بناوٹ کے لحاظ سے اس کام کو کرنے کی طاقت رکھتا ہو، اس راز کو اس آیت شریفہ میں بیان کیا گیا ہے :۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا یعنی خدائے حکیم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ یہاں "تکلیف" کے معنی دکھ بیماری کے نہیں ہیں بلکہ "تکلیف" قرآن کا محاورہ ہے اس کا مطلب ہے کہ شریعت کے قوانین پر عمل

کرنے کا حکم ایسی مخلوق کو دیا جائے جو اُس پر عمل کرنے کی استعداد رکھتی ہو (اس کے متعلق "استعداد اور تکلیف" کے زیرِ عنوان مزید تفصیل کردی گئی ہے)

عقل کا تقاضا ہے کہ اپنے صانع کا اقرار کیا جائے۔ تمام عبادات اور نیکیوں کی اصل اللہ کے وجود کا اقرار ہے۔ دُنیا پرستوں کے نزدیک خواہ اس کی اہمیت نہ ہو مگر دانش مندوں کے نزدیک خالق کا اقرار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جو لوگ واجب الوجود کا اقرار نہیں کرتے، ان کو سکون میسّر نہیں، اُن کی رُوح مضطرب رہتی ہے، وہ خدا سے نہیں ڈرتے لیکن ہر چیز سے ڈرتے ہیں، اُن کو ہر اندھیرے میں ایک بھوت، ہر بیشہ میں ایک شیر نظر آتا ہے، ان کو ہر قدم پر موت نظر آتی ہے۔ چونکہ آخرت کا یقین نہیں لہٰذا سوچتے ہیں کہ جتنا بھی جینا ہو دُنیا میں جیئں، عیش و کامرانی کے زیادہ سے زیادہ اسباب جمع کرلیں۔ قرآن میں ان ہی لوگوں کے لئے فرمایا گیا ہے کہ " ان کے دل تو ہیں مگر سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر سُنتے نہیں، یہ لوگ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی بدتر"۔ آج قرآن کو دیکھ کر فلاسفر حیران ہیں کیونکہ حقیقت ایک ہی وقت میں ان کے سامنے آگئی ہے۔

یہ دُنیا عجیب ہے۔ آج عاقل وہ سمجھا جاتا ہے جو خدا کے وجود کا انکار کردے جو یہ کہے کہ ساری کائنات طبیعت سے پیدا ہوگئی ہے۔ اگر کوئی اُن سے سوال کرے کہ انسان خود ہی پیدا ہوگیا اور اس کو بنانے والی طبیعت ہے تو انسان میں تناسب کیوں ہے؟ آنکھیں پیٹ پر یا کمر پر کیوں نہیں؟ کھانا منہ سے ہی کیوں کھایا جاتا ہے؟ دماغ سے ہی کیوں سوچا جاتا ہے؟ "بول و براز کی جگہ" جسم کے اندر اپنی ساخت کے لحاظ سے موزوں اور پوشیدہ کیوں ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ جواب دیا جاسکتا

ہے کہ ہم کو ایسا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اچھا معلوم ہوتا ہے اور کوئی خالق نہیں تو آپ کی پسندیدہ باتیں ہی کیوں پیدا ہوئیں؟ غالب نے خوب فلسفیانہ بات کہی ہے ع

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

انسان کے اعضاء کی بناوٹ میں تناسب اور حُسن کیوں ہے؟ ھَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے؟)

اقبال نے صحیح کہا ہے ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

اقبال "جاوید نامہ" میں لکھتے ہیں ؎

می شناسی طبعِ ادراک از کجا است؟ — حُورے اندر بنگہ خاک از کجاست؟
طاقتِ فکرِ حکیماں از کجاست؟ — قوتِ ذکرِ کلیماں از کجاست؟
ایں دل وایں واردات از کیست؟ — ایں فنون و معجزات از کیست؟
گرمیٔ گفتار داری؟ از تو نیست! — شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست!
ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است — فطرت از پروردگار فطرت است

جانتے ہو طبع ادراک کہاں سے آئی ہے؟ مٹی سے حسین چہرے کس نے بنائے؟ داناؤں کی دانش، کلیموں کو بولنے کی طاقت، دل اور اس میں تخیلات، فنون اور معجزات کس نے پیدا کئے؟ تجھ میں گرمیٔ گفتار ہے، مگر تیری نہیں! تجھ میں شعلۂ کردار ہے مگر کہاں سے آیا؟ میں بتلاؤں! یہ سب بہارِ فطرت کا فیض ہے اور فطرت خود اللہ کا پرتو ہے"

دُنیا کی دو چیزیں سب سے زیادہ عجیب ہیں۔ انسان اور قرآن۔ انسان

حیوان اور فرشتے کے درمیان عجیب مخلوق ہے اگر اس میں صفاتِ ملکیہ نہ ہوں تو وہ بالکل حیوان ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اور اس میں صفاتِ بہیمیہ نہ ہوں تو وہ فرشتہ ہے بلکہ اس سے بھی برتر۔ انسان کی نیکیوں کی قدر خدا کے یہاں اسی لئے زیادہ ہے کہ وہ اپنی بہیمی خواہشات کو عقل کے ذریعہ قابو میں رکھتا ہے۔ قرآن اس لئے عجیب ہے کہ اللہ کا کلام ہے، کلام، اللہ کی صفت ہے، جہاں اللہ کی صفت ہوگی وہیں اس کی ذات ہوگی۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے قرآن کی خوب مثال دی ہے انھوں نے فرمایا ہے کہ قرآن اللہ اور بندہ کے درمیان گویا ایک دستار ہے جو شہنشاہ کسی غلام کو دیدے جس کا ایک سرا بادشاہ کے پاس ہے اور دوسرا سرا بندہ نے پکڑ رکھا ہے اور شہنشاہ نے اس غلام سے کہہ رکھا ہے کہ جب تجھ کو کوئی حاجت پیش آئے تو اس دستار کو ہلا دیا کر ہم تیری حاجت پوری کر دیں گے"۔

دراصل قرآن بہت ہی انمول ہے، یہ اللہ کی صفتِ کلام ہے جو ان کی ذات پاک سے نکل کر پردہ شہود پر جلوہ گر ہوگئی ہے۔ انسان اس کا شکر ابدالآباد تک ادا کرتا رہے تب بھی ادا نہیں ہو سکتا صرف اسی نعمت کو دیکھ کر اللہ کی وہبی عنایتوں پر حیرت ہوتی ہے، افسوس ہم اس نعمت کی قدر نہیں جانتے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا تھا، عرض کیا آپ کس عمل سے زیادہ خوش ہوتے ہیں فرمایا "قرآن پڑھنے سے"۔ عرض کیا "خواہ کوئی مطلب بھی نہ سمجھتا ہو؟" ارشاد ہوا "سمجھ یا نہ سمجھے"۔ (آپ نے سوال کیا تھا کونسی عبادت سب سے افضل ہے؟ ارشاد ہوا "قرآن")

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز ظلّ کے اندر ظاہر ہوئی ہے

لیکن قرآن بغیر ظلّ (پردہ) ظاہر ہوا ہے، یہاں حجاب نہیں بے پردہ ہی جلوہ گری ہو رہی ہے، یاد رکھئے کہ اللہ کی ذات اور صفات کو "قدیم" کہتے ہیں۔ یعنی غیر فنا پذیر۔ اور دیگر اشیاء کو (جن میں انسان بھی شامل ہے) ممکن اور مُحدِث یعنی فنا پذیر کہتے ہیں۔ چونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے اس لئے بڑے بڑے علمائے محدثین کا خیال تھا کہ قرآن قدیم ہے۔ کلام خدا کی صفت ہے جو "ممکن" نہیں۔ اسی عقیدے پر امام احمد بن حنبلؒ کے کوڑے لگائے گئے، کوڑے لگتے ہوئے بھی یہی فرماتے تھے کہ "قرآن و حدیث سے ثبوت دو کہ یہ فنا پذیر اور مخلوق ہے، یہ مخلوق نہیں، اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی صفت مخلوق نہیں ہو سکتی"۔ اس نکتہ کی خاص ضرورت نہ تھی لیکن قرآن کی اہمیت بتلانے کے لئے لکھ دیا گیا ہے۔

جو علماء قرآن کو مخلوق کہتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ "اللہ کے سوا ہر چیز مخلوق ہے چونکہ قرآن خدا کے سوا ہے لہذا مخلوق ہے"۔

بہرحال دورِ حاضر کے علماء نے طے کر دیا ہے کہ قرآن کے الفاظ (الف، بے، تے، ثے وغیرہ) مخلوق ہیں لیکن حق تعالیٰ کا کلام نفسی مخلوق نہیں جو ان الفاظ کے پردہ میں ہے"۔ امام جعفر صادقؓ نے فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ سبحانہٗ قرآن میں جلوہ گر ہوئے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں سکتے"۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ قرآن عالم بالا یعنی اللہ کے پاس بلکہ ذات کی چیز ہے۔ جو حروف کا لباس پہن کر عین و عَین عالم شہود میں جلوہ گر ہو گئی ہے۔ حضرت مجدد الفِ ثانی سرہندیؒ فرماتے ہیں:۔

▪ "پس قریب ترین اشیاء بجناب قدس خداوندی جل سلطانہٗ قرآن مجید است کہ گردے از ظلیت بوے نہ رسیدہ است و

خس وخاشاک تقدیم وتاخیر در چشم محجوبان انداختہ بہ اصالت خود در عالم ظلال جلوہ گر گشتہ است، لہذا افضل عبادات تلاوت قرآن مجید آمد وشفاعت او مقبول ترین شفاعت دیگراں گشت چہ شفاعت ملکِ مقرب، چہ شفاعت نبی مرسل۔ نتائج وثمرات کہ بر تلاوت قرآنِ مجید مترتب می شود، چہ تفصیل آں تواند نمود" (مکتوبات جلد سوم ص۱۸۴)

ترجمہ:۔ سب سے قریب شئے جو اللہ سبحانہٗ سے ہے وہ قرآن مجید ہے کہ جس کو ظلمت (پردہ) کی گرد بھی نہیں لگی، جن لوگوں کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ قرآن کی تقدیم وتاخیر میں ہی اُلجھے ہوئے ہیں۔ قرآن کلام اللہ ہے عالم ظلال میں اصل حالت میں من وعن جلوہ گر ہوا ہے۔ لہذا سب سے افضل عبادت قرآنِ پاک کی تلاوت ہے۔ اس کی شفاعت قیامت میں مقبول ترین ہے خواہ مقرب فرشتہ اور نبی ہی کیوں نہ ہو، تلاوتِ قرآن پر جو نتائج وثمرات مترتب ہوتے ہیں ہم اس کی تفصیل بیان کرنے سے قاصر ہیں۔"

قرآن کا دنیا میں بھیجنا ایسا ہے جیسے اللہ سبحانہٗ جنت کا کوئی ٹکڑا یا عرش کا کوئی حصہ دنیا میں بھیجدیں۔ اکثر عیسائی علماء نے تو اپنی تصنیفات میں صاف لکھ دیا ہے کہ مسلمان قرآن پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ سے کسی بزرگ نے پوچھا تھا کہ ذکر افضل ہے یا قرآن کی تلاوت؟ انھوں نے جواب دیا" ذاکر اپنے مطلب کو جلد پہونچ جاتا ہے لیکن اس کو زوال کا خوف ہے اور کلام الٰہی کی تلاوت کرنے والے کا مطلب دیر میں حاصل ہوتا ہے لیکن حصول کے بعد اس کو زوال کا خوف نہیں۔"

اس موقع پر ہم شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا قول ان کی تفسیر "فتح العزیز" سے

نقل کرتے ہیں۔ اصل عبارت فارسی میں ہے۔ فارسی لکھنا اور پھر ترجمہ کرنا بہت جگہ گھیرے گا لہٰذا ہم صرف ترجمہ درج کرتے ہیں۔

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ؕ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

"کم سے کم قرآن کی تلاوت میں تدبّر کا مرتبہ یہ ہے کہ ہر خطاب اور ہر قصہ میں اپنے تئیں مخاطب جانے۔ اور اعلیٰ مرتبہ تدبّر یہ ہے کہ متکلّم (بولنے والا یعنی اللہ سبحانہٗ) کو اور اس کی صفات و افعال کو اس کلام میں مشاہدہ کرے۔ اور تدبّر کا متوسط مرتبہ یہ ہے کہ اس کلام کو حضرت جلّ شانہٗ سے بلا واسطہ سُنے"۔ اب اس جگہ پر جاننا چاہیئے کہ سلوک الی اللہ، اُس کی حضوری اپنے نزدیک طلب کرنے کو کہتے ہیں، لیکن چونکہ حق تعالیٰ جسمیت سے اور جسمیت کے لوازمات سے پاک ہے تو اس کی حضوری اِن تین طریقوں میں سے ایک سے ہو سکتی ہے۔ (۱) پہلا طریقہ "تصور" ہے جس کو شرع کی اصطلاح میں "تفکّر" کہتے ہیں اور اہلِ سلوک کی اصطلاح میں اس کو "مراقبہ اور نگرانی" بھی بولتے ہیں۔ (۲) دوسرا طریقہ ذکر ہے۔ (۳) تیسرا طریقہ تلاوت کلام اللہ ہے؛ چونکہ پہلا طریقہ حقیقت میں ذِکر اور یاد قلبی ہے اس لئے کبھی ذکر کو اس طریق میں شامل کر دیتے ہیں اور اس کی حضوری کی طلب کے طریقوں کو دو ہی امر میں منحصر جانتے ہیں یعنی ذکر اور تلاوت میں، لیکن ذکر، قلبی اور لسانی دونوں کو شامل ہے۔ سو جو لفظ اس ذات پاک پر بالواسطہ یا بلا واسطہ دلالت کریگا وہی مُدرکہ کے اس ذات پاک کی طرف التفات کا سبب پڑے گا اور جب وہ ذات پاک مُلتفت الیہ ہوئی تو گویا موجود (حاضر) ہوئی

اسطرح کے استحضار کا دوام حاصل ہوتا ہے تو ہم نشینی کا حکم پیدا کرتا ہے
اور اس ذات پاک کی صفتیں بشریت کی صفتوں پر غالب ہوجاتی ہیں اور
خالق کے افعال بندہ کے افعال پر حاکم ہوجاتے ہیں جس طرح حدیث قدسی
میں ہے کہ "میرا بندہ نفلیں پڑھ کر مجھ سے قربت حاصل کرتا ہے یہانتک
کہ میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اُس سے محبت کرنے
لگتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ
ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اُس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ
کام کرتا ہے، اُس کا پاؤں ہوجاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے" یعنی جب
بندہ کثرتِ عبادت سے خدا کا مقبول ہوا تو حق تعالیٰ اس کے اعضاء کا
محافظ ہوجاتا ہے، اس کے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں سب خدا کی مرضی
کے تابع ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ تقرب کا طریقہ خاص اُس ذات پاک کا ہے
اگر کوئی چاہے کہ اس طریقہ سے مخلوق سے تقرب حاصل کرے تو یہ ممکن نہیں
کیونکہ اس قسم کے تقرب میں دو چیز کا پایا جانا ضروری ہے (۱) ایک تو یہ
کہ اس کا علم محیط ہو ذاکروں کے قلبی اور لسانی اذکار کو، خواہ ذاکرین مختلف
زمانوں اور مکانوں میں ہوں اس کا علم محیط ہو یعنی ہر ذاکر کے قلبی اور لسانی
ذکر کو جانتا ہو۔ (۲) دوسری چیز یہ ہے کہ ذاکر کے مُدرکہ میں در آنے، اس
کو پُر کرنے اور اس کی صفت کا حکم پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہو جس کو
شرع (قرآن) میں دُنُو، تدلّی، نزول اور قرب کہتے ہیں۔ سو یہ دونوں
صفتیں اُسی ذات پاک کا خاصہ ہیں، کسی مخلوق میں یہ بات نہیں پائی
جاتی، ہاں بعض کافر اپنے معبودوں میں پہلی صفت ثابت کرتے ہیں اور

اہل اسلام میں بھی بعض پیر پرست اپنے پیروں کے حق میں ایسا ہی اعتقاد رکھتے ہیں، مگران کا یہ دعویٰ بے دلیل ہے حقیقت میں یہ لوگ بڑے دھوکہ میں پھنسے ہوئے ہیں اور بڑے شبہ میں گرفتار ہیں"

(تفسیر فتح العزیز ص۱۶۷)

پھر فرماتے ہیں :-

"حق تعالیٰ ہاتھ پاؤں سے پاک ہے، حدیث میں جو مثال پیش کی گئی ہے (کہ میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں وغیرہ) یہ آدمیوں کے سمجھانے کو ہے تاکہ اس کی قربت کے معنی سمجھ سکیں، پس حق تعالیٰ کی ذات پاک کا خاصہ ہے کہ اپنے یاد کرنے والے کی طرف خود نزول فرماتا ہے، اس کے نزدیک ہوتا ہے، اس کے مُدرکہ کو پُر کرتا ہے، اس کے باطنی لطیفوں پر غالب ہوتا ہے اور جو روح کو نسبت بدن کے ساتھ ہے وہی نسبت اس تدلّی کو روح کے ساتھ ہوتی ہے اور جتنی بھی مخلوقات ہیں اگرچہ روحانیات ہوں، اوّل تو علم محیط نہیں رکھتے کہ ہر ذاکر کے ذکر پر مطلع ہوں، دوسرے ذاکر کی رُوح پر استیلاء دائمی نہیں کر سکتے یعنی ہمیشہ اس کے حال سے واقف نہیں رہ سکتے، سو کلام الٰہی کی تلاوت اس واسطے اس کے قرب اور نزدیکی کا سبب بنتی ہے کہ اس کلام کے الفاظ اس کے معنی پر دلالت کرتے ہیں اور وہ معانی حق تعالیٰ کے علم میں ایک مدت دراز تک کلام نفسی کا خلعت پہن کر اور اس کی صفات ذاتی کی ایک صفت بن کر رہے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے الفاظ، حق سبحانہ، کی صفات ذاتیہ کو تلاوت کرنے کے مُدرکہ کے قریب کر دیتے ہیں، اس آمیزش

اور اتحاد کے سبب سے وہ صفتِ ذاتیہ ایک طرح سے پڑھنے والے
کی صفت ہوجاتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کا علم محیط ہے
وہ دُنُو، تدلّی اور قرب کی قدرت بھی رکھتا ہے، لہٰذا وہ قادر و مقتدر
جو کچھ ذاکرین کے حق میں اپنی عنایت اور مہربانی فرماتا ہے تو تلاوت
قرآن کرنے والے پر بہ طریقِ اَولیٰ عنایت و کرم فرمائے گا۔"

(تفسیر فتح العزیز ص۱۶۹)

ہم نے یہ اقتباس حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی تفسیر سے پیش کیا ہے چونکہ کافی افادیت رکھتا ہے اس لئے تفصیل کے ساتھ نقل کر دیا گیا ہے، ان الفاظ میں جو کشش ہے وہ ہمارے اپنے الفاظ میں نہیں ہوسکتی تھی نہ اتنا یقین بڑھ سکتا تھا جتنا کہ شاہ صاحب کے الفاظ سے بڑھے گا۔ جو غیر مسلم قرآن کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے ہیں بلکہ جو مسلمان سطحی طور پر قرآن کو دیکھتے ہیں وہ قرآن کو کیا سمجھیں گے۔ قرآن کو سمجھنے اور اس کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے کم از کم اتنی گہری نظر تو ہونی ہی چاہیئے۔

امام غزالیؒ کی رائے ہے قرآن میں جو آیا ہے کہ "اگر ہم قرآن کو پہاڑ پر بھی نازل کرتے تو وہ بھی لرز جاتا بلکہ انھوں نے یہاں تک فرمایا ہے کہ اس سے قرآن کی حقیقت مُراد ہے یعنی اگر قرآن کی حقیقت پہاڑ پر بھی نازل ہوجائے تو رائی کا ئی ہوجائے، لیکن انسان کا دل اللہ نے تکوینی طور پر ایسا بنایا ہے کہ وہ اس کو اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے یہ اس کی صناعی کا کمال ہے۔

دراصل اللہ سبحانہٗ نے ساری کائنات مکمل پیدا کی ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ خالق نے کائنات مکمل پیدا کی ہے اور کامل کی چیز کامل ہی ہُوا کرتی ہے۔ اگر کائنات میں کوئی کسر ہوتی تو دو وجہ سے ہوسکتی تھی، اوّل تو (نعوذ باللہ) خالق اس

کو مکمل نہیں کر سکتا تھا، یا کر سکتا تو بخل کی وجہ سے کمی چھوڑی، یہ دونوں احتمالات حق سبحانہٗ کے متعلق محال ہیں۔ کیونکہ وہ قادرِ مطلق ہیں۔ بخل تو اس وقت ہو جبکہ ان کی ذات کامل نہ ہو۔ وہ فیّاضِ مطلق ہیں۔ انسان اپنی خلقت پر غور کرے کیا اس میں کوئی کسر یا کمی رہ گئی ہے؟ فرض کیا کوئی یہ اعتراض کرے کہ انسان بیمار کیوں ہوتا ہے؟ یا کیوں مر جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انسان بیمار نہ ہوا کرتا تو دواؤں کے خواص، اثرات، کوئی تریاق، کوئی زہر ہے یہ کس طرح معلوم ہوتے؟ پھر حکماء اور ڈاکٹروں کی استعداد، دانائی اور فن کس طرح آشکارا ہوتے۔ ارسطو، افلاطون، بقراط وغیرہ کا نام کون جانتا؟ انسان صحت کی قدر اُسی وقت کرتا ہے جب کہ بیماری بھی ہو، مرنا بھی نعمت ہے، اگر مرنا نہ ہو تو انسان دنیا میں عالمِ بالا (جنّت) کی لیاقت پیدا کر کے کس طرح جائے۔ امام غزالیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ انسان کو دُنیا میں اس لئے لائے ہیں تاکہ یہاں رہ کر جنّت کی لیاقت پیدا کرے۔"

(کیمیائے سعادت)

غالبؔ نے اسی نکتہ کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا! نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یعنی دُنیا میں جینے کا مزا تو حقیقت میں مرنے کے بعد ہی آئے گا۔ دوسرے مرنے میں یہ حکمت ہے کہ دوسروں کے لئے جگہ خالی ہوتی رہتی ہے۔ غرض دُنیا کے سارے واقعات ساز کے پردے ہیں مگر جس کے پاس دیدۂ بینا ہی نہ ہو اس کو ساری کائنات بازیچۂ اطفال ہی نظر آئے گی۔ غالبؔ نے اپنے اوپر طنز کر کے گویا دل کے اندھوں پر طنز کیا ہے ؏

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے۔

اگر یہ طنز نہ ہوتا تو پھر وہ یہ شعر نہ کہتے ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

انسان اگر کسی چیز سے سب سے زیادہ قریب ہے تو اپنے وجود سے ہے۔ خالق نے کمال یہ کیا ہے کہ انسان کو ساری کائنات کا خلاصہ بنایا ہے اسی لئے کامل صوفیا نے انسان کو "عالم صغیر" کہا ہے، یعنی ساری کائنات کا "عطر" نکال کر انسان تیار کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں ہم اس نکتہ پر کچھ روشنی ڈال چکے ہیں یہاں ہم اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ انسان جب خود کو بھی نہیں سمجھے گا تو اس سے زیادہ احمق کون ہو سکتا ہے۔ انسان رُوح اور جسم سے مرکب ہے، پھر روح اور نفس کا جوڑا ایسا رکھا ہے جیسے شوہر اور بیوی کا۔ رُوح یا دل میں بعض احساسات ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو زبان بیان کرنے سے قاصر رہتی ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ع

زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

رُوح اور نفس کی محبت کے متعلق حضرت مجددؒ کے الفاظ یہ ہیں" ظلمت (اندھیرے) کو نور سے محبت ہو گئی ہے، نفس اندھیرا ہے اور رُوح نور ہے۔ روح لامکانی ہے اور نفس مکانی ہے، لامکانی چیز کو مکانی کے ساتھ جوڑ دینا خالق کی صناعی ہے جو قابل غور اور انتہائی حیرت انگیز ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کی ہر چیز ہی حیرت انگیز ہے لیکن چونکہ ہوش سنبھالنے کے بعد انسان سالہا سال دیکھتا ہے اس لئے حیرت ختم ہو جاتی ہے لوگ دوسری مرتبہ زندہ ہوتے (حشر و نشر) پر تعجب کرتے ہیں لیکن پہلی مرتبہ عالم وجود میں آنا اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے اس لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں هُوَ الَّذِي

خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۵ وہی تو ذات پاک ہے جس نے تم کو اوّل مرتبہ پیدا کیا جبکہ تمہارا نام لیوا بھی کوئی نہ تھا، تو دوسری مرتبہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، انسان کو صرف گوشت پوست اور ہڈیوں کا مجموعہ بنا کر، ظاہری اور باطنی حواس دیکر اس قابل بنایا کہ وہ کسب سے اخلاق پیدا کرے۔ اگر آدمی میں اخلاق نہ ہوں تو حیوان ناطق سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، اس کو حقیقی معنوں میں "انسان" نہیں کہا جا سکتا، انسان کی معراج یہ ہے کہ وہ بندہ بنے۔" غالب نے خوب کہا ہے ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اس کتاب میں متعدد مقامات پر آپ نے شیخ محی الدین ابن العربیؒ کے ایسے اقوال پڑھے (خصوصاً وحدۃ الوجود کے متعلق) جو زیادہ تر سکر یہ ہیں یعنی وہ شیخ کا حال ہے، مگر شیخ جب "صحو" (ہشیاری) کی حالت میں ہوتے تھے تو ان کا رنگ کچھ اور ہوتا تھا۔ علامہ شبلیؒ نے "الغزالی" میں لکھا ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربیؒ، امام غزالیؒ کی کتاب "احیاء العلوم الدین" کو کعبہ کے سامنے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ "صحو" کی حالت میں انھوں نے کچھ وصیتیں کی ہیں وہ بہت انمول ہیں بقول شخصے کہ۔ قلندر ہر چہ گوید ۔ دیدہ گوید۔

یعنی قلندر جو کچھ بھی کہتا ہے دیکھ کر کہتا ہے، لہٰذا ہم ان وصیتوں کو یہاں لکھتے ہیں جو تصوف کا گویا نچوڑ ہیں :۔

(۱)۔ بندے سے جب کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اُس وقت تک اس جگہ سے نہ جائے جب تک وہاں کوئی نیکی نہ کرلے تاکہ حسنات (اچھے کام) سیئات (برائیوں) کو محو کر دیں۔

(۲)۔ خداوند ذوالجلال کے ساتھ نیک گمان (حُسنِ ظن) رکھنا چاہیئے کیا معلوم کہ یہی آخری سانس ہو۔

(۳)۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر "سِرّ اور جہر" ہر حالت میں کرنا چاہیئے کیونکہ وہ بھی یاد کرتا ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا)

(۴)۔ کلمہ لاالٰہ الاّ اللہ کو بار بار کہنا چاہیئے، یہ نامۂ اعمال میں سب سے بھاری ہے اس کے ذکر کو لازم پکڑو۔

(۵)۔ جو یہ کلمہ کہے اُس سے محبت رکھنی چاہیئے۔

(۶)۔ فرائض الٰہی کو ترک نہ کرے اور نوافل کی کثرت کرے تاکہ جو کچھ کمی فرائض میں رہ گئی ہے اس کی تلافی ہو جائے۔

(۷)۔ بات اور قول کی حفاظت کرنی چاہیئے کیونکہ قول بھی عمل ہی ہے، بیہودہ بات نہ کرنی چاہیئے، خواہ اُس کا اعتقاد بھی نہ رکھتا ہو، قلتِ کلام و کثرتِ سماع۔

(۸)۔ جاندار کی تصویر ہرگز نہ کھینچنی چاہیئے اور گھر میں بھی نہ رکھنی چاہیئے۔

(۹)۔ بیمار کی تیمارداری ضرور کرنی چاہیئے کہ خداوند کریم اس سے قریب ہوتا ہے۔

(۱۰)۔ اپنے اوپر لوگوں کے حقوق نہ رکھنے چاہئیں۔ ظلم و ستم نہ کرنا چاہیئے۔ قیامت کے لئے کسی کے بوجھ کو اپنے اوپر نہ رکھنا چاہیئے۔

(۱۱)۔ کسی عالم کے موافق علم، عمل نہ کرنے سے دھوکہ میں نہ آ۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک اُس کا پایہ بہت بلند ہے اور حق سبحانہٗ کے پاس نیت اور عمل کی رُوح موجود ہے

(۱۲)۔ جو کچھ خداوند تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اس کا شکر بار بار کرنا چاہیئے، کیونکہ (شکر نعمتوں کی زیادتی کا سبب ہے اور کفرانِ نعمت نہ کرنا چاہیئے۔)

(۱۳)۔ خداوند کریم کے ساتھ شرکِ جلی و خفی نہ کرنا چاہیئے۔ شرکِ جلی تو ظاہر ہی ہے

شرکِ خفی کہتے ہیں اسباب دنیوی پر اعتماد کرنے کو۔ اسباب دنیوی بھی قادرِ مطلق کے اختیار میں ہیں، ہم سعیٔ کر سکتے ہیں مگر اسباب پر ہرگز توکل اور اعتماد نہ کرنا چاہیئے اور اطمینان قلبی نہ کرنا چاہیئے۔

(۱۴)۔ اپنے متعلق بڑے ہونے کا خیال ہرگز نہیں آنا چاہیئے، اگر انجام بھی ہو حق شہود ہو اور عالم نظر سے مفقود ہو۔

(۱۵) حق اور باطل دونوں پر مناظرہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس کا ضرر نفع سے زیادہ ہے

(۱۶)۔ ہر حال میں حُسنِ خُلق اختیار کرنا چاہیئے۔

(۱۷)۔ ہجرت دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف اگر موقع ہو کرنی چاہیئے۔

(۱۸)۔ ہر حال اور حرکات و سکنات میں علم کا استعمال کرنا چاہیئے۔

(۱۹) لوگوں کے کام آنا چاہیئے، افشائے سلام، اطعامِ طعام، سعیٔ در قضائے حوائج۔

(۲۰)۔ مصیبت اور غم میں استرجاع کرنا چاہیئے (یعنی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہنا) کیونکہ اس سے بڑی مصیبت بھی پڑ سکتی تھی اور "اِنَّا لِلّٰہِ" کہنے سے اجر زیادہ ہوگا۔

(۲۱)۔ تلاوتِ قرآن کو لازم سمجھیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کا کلام ہے۔

(۲۲)۔ عالموں کی صحبت میں بیٹھنا چاہیئے کہ "لَا یَشْقٰی جَلِیْسُھُمْ"، (عالموں کے پاس بیٹھنے والا بدبخت نہیں ہو سکتا۔ حدیث)

(۲۳)۔ آدمیوں کے درمیان حق فیصلہ کرنا چاہیئے۔

(۲۴)۔ دُعا اکثر سجدہ میں کرنی چاہیئے کیونکہ بندہ خدا کے نہایت قریب ہوتا ہے۔ حدیث ہے اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّہٖ وَھُوَ سَاجِدٌ یعنی بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب حالتِ سجدہ میں ہوتا ہے۔

(۲۵) حرام سے پرہیز کرو۔

(۲۶)۔ اللہ کے ساتھ عہد اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں) اُستوار رکھنا چاہیئے۔

(۲۷)۔ صدقہ مالی و زبانی (ذِکر) کرنا چاہیئے۔

(۲۸)۔ کسی اہلِ قبیلہ کو کافر مت کہو۔

(۲۹)۔ بدوں میں سے نہ ہونا چاہیئے کہ لوگ تم سے پرہیز کرنے لگیں۔

(۳۰)۔ اگر کسی کو نصیحت کرو تو یہ دیکھو کہ اوّل تم خود اس پر عمل کرنے والے ہو۔

(۳۱)۔ اگر تم چاہو کہ تمہاری مغفرت ہو تو اپنے کو گناہوں سے بچانے کی التجا جناب باری میں کرو۔ تم سے ایسے کام سرزد ہونے چاہئیں جو قبر میں تمہارے مونس و غمخوار ہوں۔ دنیا فانی ہے اس لئے صرف زادِ راہ لینا چاہیئے، اس کی دلفریبیوں میں مست ہو کر اس میں منہمک اور آخرت سے غافل نہ ہونا چاہیئے کہ تم سے پہلے بھی محفلیں گرم ہوئیں اور تمہارے بعد بھی ہوں گی مگر دنیا نے کسی کے ساتھ وفا نہ کی ؎

گماں مبر کہ تو چوں بگذری جہاں بہ گذشت   ہزار شمع بہ کُشتند و انجمن باقی ست

(ریاض المرتاض از نواب صدیق خاں)

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات کی جلد اوّل کے مکتوب ۳۶ میں لکھتے ہیں:

"شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم، عمل، اخلاص۔ طریقت و حقیقت کے صوفیاء اس میں ممتاز ہوئے ہیں، یہ دونوں ہی شریعت کی خادم ہیں۔ جب کوئی شخص شریعت کے اتباع میں کامل ہو گیا تو سمجھ لو کہ اس کو دنیا و آخرت کی ساری سعادتیں حاصل ہو گئیں۔ شریعت

میں کوئی مقصد ایسا باقی نہیں رہا کہ شریعت کے سوا کسی اور بات کی ضرورت پڑے۔ شریعت کے راستے پر چلتے ہوئے صوفیاء کو جو حالات (ومشاہدات) پیش آتے ہیں وہ مقاصد نہیں ہیں۔ طریقت اور حقیقت کی جو منزلیں ہیں ان کا مقصد اخلاص حاصل کرنا ہے۔ جو مقام رضا کے لئے ضروری ہے۔ جو کوتہ اندیش ہیں وہ مشاہدات اور تجلیات کو مقاصد و مطالب میں شمار کرتے ہیں۔ یہ فقیر (خود حضرت مجددؒ) دس سال تک اس مقصد کی تلاش میں رہا۔ خدا کا شکر ہے اتنی مدت کے بعد شریعت کی حقیقت حاصل ہوئی۔

امام المسلمین امام اعظم کوفیؒ (امام ابوحنیفہ) رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے سُبْحَانَكَ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَلٰكِنْ عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ (تو پاک ہے ہم نے تیری عبادت ویسی نہیں کی جیسا کہ اس عبادت کا حق ہے لیکن تجھ کو ہم نے پہچانا جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے)۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اللہ کی عبادت ویسی نہیں کر سکتا جیسا کہ اس کی عبادت کا حق ہے لیکن معرفت کی حد یہ ہے کہ ذات حق سبحانہٗ کو اس کی بے چونی و بے چگونی کے ساتھ پہچانے۔"

میں کہتا ہوں (یعنی حضرت مجدد فرماتے ہیں)" امام اعظمؒ نے اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں کیا کہ مبتدی کو صرف علم حاصل ہوتا ہے اور منتہی کو معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یہ دولت فانی کو حاصل ہوتی ہے جیسا کہ مولانا رومؒ نے فرمایا ہے ؎

ہیچ کس را تانہ گردد او فنا نیست رہ در بارگاہ کبریا۔

یعنی جب تک کوئی شخص فنا نہ ہو جائے اُس وقت تک وہ بارگاہ کبریائی میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دراصل تصوف کا مقصد ہی ایمان کا دِل میں رچ جانا ہے اِس سے پہلے حضرت مجددؒ اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

طریق صوفیاء کا مقصد یہ نہیں کہ شریعت کے علاوہ کوئی اور نئی بات حاصل کریں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ استدلالی ایمان کشفی ہو جائے اور قلب مطمئن ہو جائے۔ اِس سلسلہ میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اچھا نکتہ بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں:۔

"انسان سے مشاہدہ اور کشف مقصود نہیں ہے (محمود ہے) بلکہ اعمال مقصود ہیں۔ ورنہ دنیا میں آنے سے پہلے حضور دائم میسر تھا۔ دنیا میں اعمال اِس لئے کئے جاتے ہیں تاکہ اُن پر اجر متعین ہو۔"

مولانا نے یہ بھی فرمایا ہے:۔

"حق تعالیٰ کسی کو بسط (مسرت) عنایت کرتے ہیں، کسی کو قبض (رنج و غم) جو اس کے حال کے مناسب ہوتا ہے۔ انسان کو رضا و تسلیم کی خو اختیار کرنا چاہیئے، یوں نہ کہنا چاہیئے کہ فلاں حالت پر ہوتا تو بہتر تھا۔ جتنا تعلق انسان کو غیر اللہ سے ہوگا اتنا ہی اس کے دُنیوی فعل کا اثر قلب پر زیادہ ہوگا، اگر اللہ سے زیادہ تعلق ہوگا تو دُنیوی کاموں کی تاریکی کا اثر دل پر بہت کم ہوگا۔ تقویتِ خیال میں بدنِ انسانی کو بہت دخل ہے کیونکہ طاقت بدنی سے نفسانی قوت زیادہ ہوتی ہے اور نفسانی قوت سے خیال کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔"

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا تصور یہ ہے کہ عقل فی حد ذاتہٖ احکام الٰہی کے سمجھنے میں

ناتمام ہے لیکن حصولِ تصفیہ و تزکیہ یعنی دل صاف کرنے کے بعد عقل کو حق سبحانہ وتعالیٰ سے مناسبت و اتصال حاصل ہوتا ہے، ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"چرا نتواند کہ بعد از حصولِ تصفیہ و تزکیہ عقل را منا سبتے و اتصالے غیر متکیف بمرتبۂ وجوب تعالیٰ و تقدس پیدا شود"

اب حضرت مجددؒ نے سوال کیا ہے کہ صفائی قلب کے بعد حق سبحانہ سے کیوں بے کیفیت قرب حاصل نہ ہو؟ پھر خود ہی جواب دیا ہے:۔

"اگرچہ عقل کو مناسبت اور اتصال پیدا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ انسان کی روح اس جسم میں قید ہے، حرص، غضب، شہوت بھی ساتھ ہیں لہذا سہو و نسیان بھی انسان کے ساتھ لازم ہیں، اس سے منفک نہیں ہو سکتے، خطا اور غلطی اس سے جدا نہیں ہو سکتیں لہذا محض عقل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا بخلاف فرشتہ کہ وہ ان باتوں سے پاک ہے۔ البتہ عقل کو نبوت سے جو فیض حاصل ہو گا اس کی وجہ سے وہ صواب کے قریب ہو گی"

مولانا اصغر علی روحیؒ نے فرمایا ہے:۔

"لفظ عقل کا استعمال عموماً دو طرح پر آیا کرتا ہے۔ اوّل عقل مطبوع، یہ نورِ فطرت ہے جو خلقتِ انسان کے ساتھ ہی خداوند کریم کی طرف سے ودیعت کیا جاتا ہے یہ نورِ فطرت مختلف لوگوں میں ایک ہی درجہ پر موجود نہیں ہوتا۔

دوسری عقل مسموع۔ یعنی وہ نورِ علم جو انسان بذریعہ تعلیم و تعلم حاصل کرتا ہے اور جو تجربہ اور مشاہدہ سے زیادہ کیا جا سکتا ہے"

یونانی حکماء کی ایک اصطلاح ہے اس کو THEOSOPHY کہتے ہیں۔ افلاطون اور دیگر چند حکماء کا عقیدہ ہے کہ "ہر شخص خدا کی معرفت روحانی وجدان سے حاصل کر سکتا ہے"۔ ہمارے نزدیک یہ وہی عقل مطبوع یا نور فطرت ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اسی لئے محققین اسلام کا خیال ہے کہ جس دور جگہ یا جزیرہ میں اسلام نہ پہونچا ہو اور وہاں کے لوگ صرف نور فطرت سے اپنے پروردگار کا یقین رکھتے ہوں ان کو حق سبحانہ اپنے کرم سے بخش دیگا"۔ امام غزالیؒ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید بحث "ایمان اور کفر" کے زیر عنوان ملے گی۔

امام فخر الدین رازیؒ "تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:۔

"عالم تین قسم کے ہوتے ہیں، عالم باللہ، عالم بامر اللہ، عالم باللہ و بامر اللہ"۔ عالم بامر اللہ کی علامت امام صاحب نے یہ لکھی ہے کہ اس کو اللہ کے احکام کا علم ہو، اللہ کا علم نہ ہو (یہ عالم ظاہر کہلاتا ہے) اللہ کا زبان سے ذکر کرے دل سے نہ کرے، خلق سے نہ ڈرے، پروردگار سے نہ ڈرے۔ لوگوں سے شرم وحیا کرے، اللہ سے شرم وحیا نہ کرے"۔

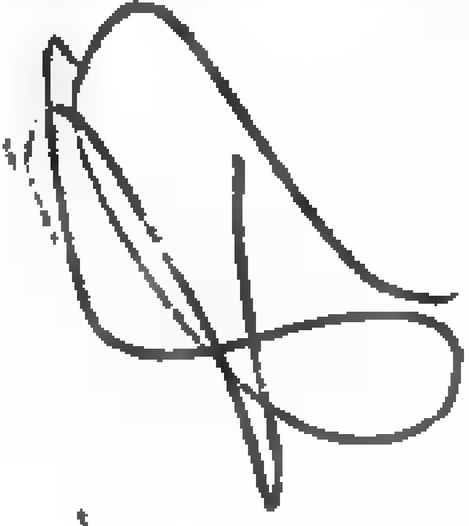
عالم باللہ کی علامت یہ بیان کی ہے کہ اس کو اللہ کا علم ہے اللہ کے احکام کا علم نہیں ہے، اللہ کا دل سے ذکر کرے زبان سے نہ کرے، ریا کا خوف ہو گناہ کا خوف نہ ہو۔ دل میں جو خطرات آتے ہیں اُن سے حیا ہو ظاہر کی حیا نہ ہو"۔

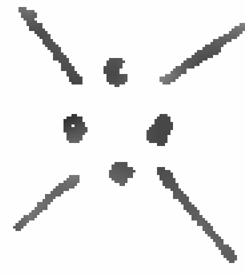
عالم باللہ و بامر اللہ کی علامت یہ ہے کہ اس کو اللہ اور اس کے احکام، دونوں کا علم ہو۔ یہ عالم گویا عالم شہادت اور

عالم غیب کی سرحد پر بیٹھا ہوا ہے ۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں :۔

"حیوانات کے افعال سے ان کی طبیعتوں پر اثر راسخ نہیں ہوا کرتا مگر انسان جو فعل کرتا ہے تو فراغ کے بعد وہ افعال تو نابود ہو جاتے ہیں لیکن ان کی روحیں جدا ہو کر نفس میں بیٹھ جاتی ہیں۔ اس سے ہی نفس میں ایک نور یا تاریکی باقی رہ جاتی ہے اس سے بلند حالات اور مقامات پیش آتے ہیں جیسے اللہ کی محبت اور خدا پر توکل وغیرہ۔





محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

رسول پاکؐ کی تعریف میں غالب کا یہ حسین شعر ہے۔ جامیؒ نے بھی کہا ہے :-

ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

یعنی اللہ کے بعد آپ ہی مرتبہ میں ہر جن و بشر اور فرشتے سے بڑے ہیں" چونکہ حضورؐ کا ذکر ہے لہذا کچھ تفصیل سے ہی بیان کر دیا جائے۔ محبوب کا ذکر جتنی مرتبہ بھی کیا جائے اور سنا جائے کم ہے۔ چھٹی صدی عیسوی ، تاریخ عالم کا تاریک ترین دور تھا، کفر و الحاد کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، ظلم و ستم کا بازار گرم تھا زنا، چوری، ڈکیتی لوگوں کے عام شغل تھے۔ رومۃ الکبریٰ میں مذہب کے نام پر خون کی ارزانی تھی، غلاموں کو جانوروں کی طرح لڑایا جاتا تھا، شراب نوشی عام تھی، آتش پرستی بڑے کروفر سے ہو رہی تھی، بت پرستی نہ صرف ساری دنیا میں بلکہ کعبہ میں ہو رہی تھی، عیسائی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے مجسموں کی پرستش کر رہے تھے عورتوں کو گرجاؤں میں شرمناک سزائیں دی جاتی تھیں، عرب کی حالت اور بھی بدتر تھی، بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیا جاتا تھا، معمولی معمولی جھگڑوں پر پچاس پچاس برس تک لڑتے تھے، خدائی قانون پر پردے ڈال دیئے گئے تھے، ہر علاقہ بلکہ ہر قبیلہ

کا جدا مذہب اور جدا بت تھا۔ کلیسا میں، بت خانے اور صومعے صنم خانے بن گئے تھے، خاص کعبہ شریفہ میں تین سو ساٹھ ۳۶۰ بت رکھ دیے گئے تھے۔

ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔

ازل سے خالق کائنات کو انسان کی طرف توجہ خاص رہی ہے، اس کو بنانے میں پورا کمال دکھایا ہے، اس کی رحمت نے گوارا نہ کیا کہ جس کی جناب میں گستاخی فرشتہ برداشت نہیں کی جاتی وہ حیوان بن جائے۔ چنانچہ غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور ابرِ رحمت کوہِ فاران کی طرف بڑھا۔ ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا پہلوئے آمنہ سے ہویدا ہوئی۔ خزانۂ رحمت کا ایک درِ یتیم عالم شہود میں جلوہ گر ہوا جس کو آگے چل کر زمانے نے محمد الرسول اللہ کے پیارے نام سے پکارا، حضور کے والد عبد اللہ آپ کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ ذات پاک اپنا سایہ ڈالنا چاہتی تھی اس لئے باپ کے سائے کی ضرورت نہ تھی۔ رحمتِ تمام نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ حکیم و خبیر نے ۵۷۶ء میں یعنی پیدائش کے پانچ سال بعد ماں کا سایا بھی اٹھا لیا۔ والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد دادا عبد المطلب نے پالا پوسا، لیکن ۵۸۹ء میں وہ بھی انتقال کر گئے۔ ان کے بعد آپ کے چچا ابو طالب (حضرت علیؓ کے والد) نے آپؐ کی پرورش کی اور ساری عمر حضورؐ کی حفاظت کے لئے سینہ سپر رہے۔ آپ بچپن میں کبھی بچوں کے ساتھ نہیں کھیلے، کوئی کھیل تماشا نہیں دیکھا، ایک مرتبہ کوئی تماشا دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تھے، لیکن نیند آگئی جس کو وہ بچاتے ہیں یوں بچاتے ہیں۔ جوان ہوئے، عقل کامل ہو گئی، چاروں طرف نظر دوڑائی، اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا، لوگوں کو بتوں کی پوجا کرتے دیکھ کر تعجب ہوا، اللہ عزوجل نے فطری طور پر ایمان بخشا تھا، اخلاق میں تو کوئی ثانی نہ تھا، امانت کا یہ

عالم تھا کہ نبوت ملنے سے پہلے امین مشہور ہو گئے تھے۔ مکہ کی ایک دولتمند اور نیک خاتون حضرت خدیجہ رضؓ کا مال فروخت کرنے کے لئے باہر جانے لگے۔ تقریباً پچیس ۲۵ سال کی عمر میں حضرت خدیجہ رضؓ سے شادی کی جن کی عمر اس وقت چالیس ۴۰ سال کی تھی سنہ ۶۲۰ء میں حضرت خدیجہ رضؓ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت خدیجہ رضؓ سے قاسم پیدا ہوئے۔ اسی لئے شروع میں لوگ حضورؐ کو ابوالقاسم کہہ کر پکارتے تھے۔ ان سے چار صاحبزادیاں پیدا ہوئیں حضرت زینب رضؓ، حضرت رقیہ رضؓ حضرت ام کلثوم رضؓ، اور حضرت فاطمہ رضؓ۔ حضرتؐ کو ۱۷ رمضان المبارک مطابق ۱۶ اگست سنہ ۶۱۰ء کو نبوت ملی۔ اور ساری دنیا کو اندھیرے سے نکال کر اجالے میں لانے کا بیڑا اٹھایا۔

ایک دن خالق کا حکم پہونچا کہ ساری دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اُٹھیے۔ آپ کمبل اوڑھے ہوئے لیٹے تھے اس وقت جبرئیلؑ حق سبحانہ کا یہ پیغام لائے:۔ یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ " اے کملی میں لپٹے ہوئے اٹھ اور دنیا کو عذابِ الٰہی سے ڈرا"۔ حکم کا ملنا تھا کہ فوراً اُٹھ گئے اور عالم والوں کو توحید کا درس دینا شروع کیا۔ کفار نے ناقابلِ بیان تکلیفیں پہونچائیں، پتھر کھائے، خون نکلا۔ ابوطالب نے سمجھایا کہ بھتیجے ایسا نہ کرو، میں کہاں تک تمہاری حفاظت کرونگا۔ حضورؐ نے بہادری کے ساتھ فرمایا "گردن اُڑ جائے یا چاند اور سورج کو میرے ہاتھوں میں دیدیا جائے میں تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا، ربّ قدیر نے مجھے اس کام پر مامور کیا ہے"۔ پھر عرب والوں کو تلقین کی، ایران کے کج کلاہ کو ڈرایا اور رومتہ الکبریٰ کے بادشاہ کو دعوت دی۔ ابنائے وطن نے مکہ میں رہنا مشکل کر دیا تو ۲۴ ستمبر سنہ ۶۲۲ء کو مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی۔ یہاں پہونچ کر پھر تبلیغ شروع کی۔ صورت میں کشش تھی اور آواز میں جادو، جس نے دیکھا بندۂ بے دام ہوا، جس

نے باتیں سنیں، در کا غلام ہوا۔ عبداللہ بن سلام نے دیکھتے ہی کہا لیس هٰذا بِوَجْهِہٖ کَذَّابٌ (اس شکل وصورت کا آدمی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ سب مسلمان ہو گئے۔ جب کفار نے دیکھا کہ مدینہ پہونچ کر محمدؐ کو اور عروج حاصل ہو گیا تو وہ جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ چنانچہ ابو جہل اور ابو سفیان وغیرہ ایک ہزار مسلح اور طاقتور جوانوں کو لے کر میدان میں آئے۔ حضورؐ کو معلوم ہوا، آپؐ صرف تین سو تیرہ جاں نثاروں کو لے کر آگے بڑھے۔ لیکن ہتھیار کافی نہ تھے، چار آدمیوں میں ایک تلوار یا ایک نیزہ تھا۔ تلواریں بھی زنگ آلود، خود کی جگہ سروں پر رسیاں بندھی ہوئی تھیں، زرہ بکتر کی بجائے ٹاٹ کے کرتے تھے۔ مٹھی بھر مجاہد اپنے سے تین گنے سے بھی زیادہ کفار کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ ایک طرف چراغ مصطفوی تھا دوسری طرف شرار بولہبی۔ یہ معمولی جنگ نہیں تھی، ہمیشہ کے لئے کفر و ایمان کا فیصلہ ہونا تھا۔ یہ معمولی جھڑپ نہیں تھی، حق اور باطل کا سب سے پہلا اور معرکۃ الآرا مقابلہ تھا۔ اُدھر کفار پوری طرح مسلح، اِدھر چند بے سروسامان حق پرست۔ یہ حالت دیکھ کر آپؐ سجدے میں گر پڑے، چادر کندھوں سے ڈھلک کر نیچے گری۔ ابوبکر صدیقؓ پاس آکر کھڑے ہو گئے حضورؐ نے ڈبڈبائی آنکھوں اور درد بھرے لہجے میں اللہ کو پکارا "اَللّٰھُمَّ اِنْ تَشَاءَ لَا تُعْبَدُ بَعْدَ الْیَوْمِ اے اللہ آج ہی فیصلہ ہے یا تو اسلام کو غالب کر ورنہ آج کے بعد پھر کبھی دنیا میں تیری عبادت نہ ہوگی" یہ آواز دل کی گہرائی سے نکلی تھی۔ ساتوں آسمانوں کو پار کر گئی۔ ابوبکر صدیقؓ کانپ گئے اور کہا یا رسول اللہؐ آپ نے تو حد کی بات کہہ دی۔ یہ سن کر آپؐ اٹھے، اطمینان قلب پیدا ہو گیا تھا، چند کنکریاں اٹھائیں اور کفار کی طرف پھینکیں اور جوش میں فرمایا سَیُھْزَمُ

اُنجمعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرُ یہ کفّار کا لشکر اب پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے۔

یہ واقعہ ۱۳ مارچ ۶۲۴ء کو ہوا۔ اسلام اور کفر کی پہلی جنگ تھی جو اس زمین پر لڑی گئی۔ سب سے پہلے سعد ابن ابی وقاص نے تیر پھینکا، یہ پہلا تیر تھا جو خدا کی راہ میں پھینکا گیا تھا۔ کفار کو شکست فاش ہوئی، ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ ان میں ابوجہل بھی تھا۔ اسی روز اسلام کی فتح کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس کے بعد فرزندانِ توحید نے نصف صدی میں ایران اور روم کے تاجداروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ نصف کرۂ ارض پر اسلام کا پرچم لہرا دیا، حضورؐ نے بادشاہوں کو خطوط لکھے "اَسْلِمْ تَسْلِمْ" اسلام لاسلامت رہے گا، یعنی دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ایران کے بادشاہ نے خط پڑھ کر پھاڑ دیا۔ آپؐ کو وحی سے معلوم ہوگیا فرمایا اِذَا ھَلَکَ کِسْرٰی، لَا کِسْرٰی بَعْدَہٗ یعنی جب ایران کا یہ بادشاہ ہلاک ہوجائے گا اِس کے بعد پھر کوئی آتش پرست ایران کا بادشاہ نہیں ہوگا۔" اسی روز رات کے وقت اس کے بیٹے نے بادشاہ کا پیٹ چاک کر دیا، کچھ عرصہ کے بعد ایران مسلمانوں کے ہاتھوں پر فتح ہوگیا۔ پھر جنگِ خندق ہوئی، مدینہ کو کافروں نے گھیر لیا، آپؐ نے زمین کھودتے ہوئے ایک بڑے پتھر پر کدال مارا اس سے ایک شعلہ بلند ہوا، آپؐ نے فرمایا " اللہ اکبر، مجھے ایران و روم کے محل نظر آگئے جو مسلمانوں کے ہاتھوں پر فتح ہوں گے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ بلا تفاوت اسی طرح ہُوا۔

حضورؐ نے کبھی گوشہ نشینی اختیار نہیں کی۔ ساری عمر جد و جہد اور دین اسلام کے کاموں میں گذاری۔ رات کو عبادت کرتے تھے، اللہ کا شکر کرتے تھے اور روتے تھے مگر میدان جنگ میں گھوڑا دوڑا کر چھڑی سے صفوں کو درست کرتے تھے، دونوں

وقت پیٹ بھر کر کبھی نہیں کھایا۔ نرم دل بھی تھے اور شجاع بھی۔ ایک دفعہ گھمسان کی جنگ شروع ہوئی تو فرمایا ھٰذَا حِیْنَ حَمِیَ الْوَطِیْس (ہاں اب جنگ کا تنور گرم ہوا ہے)۔ حق و صداقت کا پیکر تھے، روئے انور دیکھ کر اللہ یاد آتا تھا آپؐ نے اپنی مبارک زندگی میں قرآن حکیم پر مکمل طور پر عمل کر کے دکھلا دیا حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں آپ کا خلق قرآن تھا، یعنی قرآن علم ہے اور آپؐ اس کا عملی نمونہ تھے، بہت رحمدل تھے، میدان جنگ میں اپنے ہاتھ سے کسی کافر کو قتل نہیں کیا، صرف ابی بن خلف کو برچھے سے معمولی طور پر زخمی کیا تھا، لیکن وہ چیخنے لگا اور خوف کی وجہ سے مرگیا۔ اللہ عزّوجلّ نے جس کام کے لئے آپؐ کو دُنیا میں بھیجا تھا اُس فرض کو خوب انجام دیا۔ حجۃ الوداع (یعنی آخری حج) کے موقع پر لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں اونٹ پر سوار ہو کر تقریر کی، شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اُٹھائی اور پھر لوگوں کی طرف کی اور فرمایا " اَللّٰھُمَّ اَشْھَدْ یعنی یا اللہ گواہ رہنا میں نے مرنے سے پہلے اتنے آدمیوں کو آپ کے دین میں داخل کر دیا ہے، اس کے بعد آپؐ تقریباً تین ماہ اس دُنیا میں رہے، چند روز علیل رہ کر یہ آفتاب رسالت دُنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَیْہِ

حضورؐ کے حق ہونے کی غیروں نے بھی شہادت دی ہے۔ نپولین بونا پارٹ کہتا ہے " محمدؐ کی ذات ایک مرکزِ ثقل تھی، جس کی طرف لوگ کھنچتے چلے آتے تھے، اُن کی تعلیمات نے لوگوں کو اپنا مطیع بنا لیا تھا جنھوں نے چند سال میں اسلام کا غلبہ دنیا میں کر دیا۔ اسلام کے اِن پیروؤں نے دُنیا کو جھوٹے خداؤں سے چھڑا دیا، بُت سرنگوں کر دیئے، حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ کی ہستی بہت بڑی ہستی تھی "

(بونا پارٹ اور اسلام از شیفلز صفحہ ۱۰۵)

سی۔ ایف۔ انڈر یوز رقم طراز ہے:

"دُنیا میں ایسے لوگ خال خال ہی ملیں گے جن کی بزرگی وعظمت کی رُوحِ جلیل اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ ظاہری اسباب دنیادی معدوم تھے، ایسی برگزیدگی، شرف وجلالت کی دلیل ہمیں محمدؐ میں ملتی ہے۔"

حال ہی میں جارج برنارڈ شا بڑے مشہور فلاسفر گزرے ہیں، انھوں نے اپنے قلب کی گہرائی سے کہا ہے:

"اس وقت ساری دُنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے، اب کوئی اس کو تباہی سے نہیں بچا سکتا، اگر اس کو بچانا ہے تو محمدؐ جیسی ہستی کہیں سے ڈھونڈھ کر لاؤ۔"

جارج برناڈشا نے اپنی فراست سے وہی بات کہی جو اب سے تقریباً چھ سو سال پہلے مولانا عبدالرحمٰن جامی نے حُبِّ رسولؐ کے جذبات سے سرشار ہو کر کہی تھی ؎

اے بہ سراپردۂ یثرب بہ خواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

(اے مدینہ کی آرام گاہ میں سونے والےؐ، اُٹھ اور نکل کر دیکھ کہ دُنیا مشرق سے مغرب تک خراب ہو چکی ہے)۔ دیکھئے غالب نے کتنا سچ کہا ہے ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

☆

(signature)

غالب اور تصوف

[illegible]

نیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی